# درپن

شکیلہ اختر

مکتبہ اردو لاہور

# درپن

شکیلہ اختر

مکتبہ اُردو لاہور

اشاعت اوّل

قیمت 8.00

بی۔ آر۔ پریس میں باہتمام چودھری نذیر احمد چھپکر مکتبہ اُردو لاہور سے شائع ہوا۔

# فہرس


| | |
|---|---|
| بکھرے ہوئے پھول | ۵ |
| بزدل | ۱۱ |
| نئے طریقے | ۴۱ |
| لوکٹ | ۵۷ |
| انتظار | ۶۷ |
| شہنا | ۸۵ |
| شفیق | ۹۷ |

سڑک پر ۱۰۹
ایک بیل ۱۱۹
بوڑھا مدرس ۱۳۱
تین تارے ۱۴۳
کچے دھاگے ۱۶۹
سہاگ ۱۸۵
شرح خبندی ۲۰۱

# بکھرے ہوئے پھول

روز روز ٹنکچر، آئیڈو فارم اور کلورین کی ایک ہی بُو دروازے کے پردوں سے ٹکراتی ہوئی آکر میری وحشتوں میں اضافہ کرتی رہتی۔ اور ٹھیک کیبن کے سامنے جب آپریشن رُوم سے ایتھر کی چکرا دینے والی تیز مہک پھیلتی تو سینٹ سے بھیگے ہوئے رومال سے مُنہ کو چھپائے تھوڑی دیر تک کیلئے میں خود کو بیہوش سمجھنے لگتی۔ جب تک آنکھیں بخار سے جلتی رہی تھیں۔ خاموش لیٹی میں بڑی بے بسی محسوس کرتی رہی تھی۔ لیکن جب سے پہیّہ لگی آرام کرسی پر ٹہلائی جانے لگی تھی پھر تو کیبن کے خیال سے ہی دل گھبرانے لگتا۔ کمرے

کے اندر بس وہی ایک طرح کی گنی ہوئی مخصوص چیزوں کو دیکھتے دیکھتے آنکھیں پتھرا گئی تھیں اور اس کے بعد ملنے والوں کی ہمیشہ ایک ہی رٹی ہوئی تکلیف دہ مزاج پرسیوں سے جیسے کان پک گئے تھے۔ مگر کیبن کے باہر ——

حیات و موت کی کشاکش، امید و یاس کی جد وجہد، بے آس تمنائیں خاموش فریاد اور ملتجی نگاہیں، میری بے حس رگوں کے منجمد خون میں زندگی کی چنگاریاں سلگنے لگیں۔ کیسے میں اتنے دنوں تک ویران کمرے میں چپ چاپ پڑی رہ گئی تھی —؟

سارا دن ڈاکٹر انور کا غصیلا چہرہ نظر نہ آیا تھا۔ ہر وقت پینٹ کی کریز کو سیدھا رکھنے والا ڈاکٹر مجھے ذرا بھی پسند نہ تھا۔ سکڑی ہوئی بھویں اور ٹیڑھے کٹے ہوئے لبوں کے ساتھ جب وہ کراہتے ہوئے غریب مریضوں کے بلکتے ہوئے عزیزوں کو سختی سے ڈانٹ کر نکالتا تو اپنے کیبن میں لیٹی ہوئی میں اپنا منہ دوسری طرف کر لیتی۔

اُسے اپنی پوزیشن کا بڑا خیال رہتا اور تعریفیں تو شاید اُس کی روحانی غذا تھیں وہ اپنے جنرل وارڈ کی کچ پر ننگے پاؤں کے داغ ذرا بھی دیکھنا نہ چاہتا تھا۔ بہت سے مریضوں کی کئی چیزیں اُس نے گندی کہہ کر باہر پھینکوا دی تھیں۔ اس کے وارڈ میں عام طور پر ملنے ملانے کی بڑی پابندیاں تھیں۔ (سارے جنرل وارڈ کے غریب اور بے بس مریض انتہائی تکلیف

میں بس یتیں، سب سے بڑھ کر سختی کے ساتھ اُس کا یہ حکم تھا کہ مرنے کے بعد کوئی ماتم نہ کرے۔ تہذیب جدید کی باتیں بھلا ڈاکٹر انور سے زیادہ اور کون جان سکتا تھا۔ یورپ کے ہسپتالوں کی تعریفیں سن کر بچارا ڈاکٹر ہندوستان کے بھوکے مریضوں کو شاید بھول چکا تھا۔ اسٹاف میں اس کی بڑی عزت تھی اور ہر جگہ اُس کی باتیں سراہی جاتی تھیں۔ اگست کی آسمانی ہوئی گرمی میں کسی کو وقت سے پہلے پنکھا کھولنے کی اجازت نہ تھی، مگر کیبن سے پنکھوں کی تیز گھنگھناہٹ ہر وقت سُنائی دیتی اور قریب ہی دوسرے کیبن سے تھوڑی تھوڑی دیر پر چھوٹے چھوٹے بچّوں کی لڑائیوں کا شور بلند ہوتا رہتا۔ کیبن کے ملنے والے طرح طرح کے لوگ قسم قسم کی آوازوں میں آہستہ اور زور زور سے باتیں کرتے ہوئے بے معنی ہر طرف چکر لگاتے۔ ڈاکٹر انور بڑی فراخ دلی سے کیبن کے مہذب مریضوں کا خیال رکھتا وہ اپنے ڈیوٹی روم میں جب کاموں سے تھک جاتا تو یہاں آکر اِدھر اُدھر کی باتوں سے بہل لیتا اُسے اپنے جنرل وارڈ کے مریضوں سے بڑی شکایت تھی کہ وہ میلے اور بد تہذیب ہیں وہ دیر تک ان کی حالت اور ذہنیت پر تبصرے کرتا اور پھر ہنستا ہوا کہتا "گھناؤنے کپڑے کھردرے چمڑے اور گندے جسم والے مریضوں کے لئے یہ مفت کے کثیر اخراجات والے انتظام جنہوں نے ساری عمر چٹائیوں پر بسر کی ہے ان کے لئے گدّے دار لچکیلے پلنگ بھولنے

والی ربڑ کی کرسیاں لِفٹ اور یہ ٹرولباں۔ وہ اپنی گھنی گھنی بھوؤں کو ایک دوسرے سے ملا کر کہتا "آخر یورپین وارڈ کے مریض بھی تو ایک ہیں، کتنے بلند اخلاق ہنسنے اور ہنسانے والے، اسی لئے تو وہ زیادہ تر وہیں کا ہو کر سرجن رہا تھا۔ ڈاکٹر انور کے جوتے کی مخصوص آواز میں پہچان چکی تھی، اس کی امتیازی خصوصیت چوڑی پیشانی اور لمبی ناک تھی وہ اپنے اکڑے ہوئے سینے پر ایک خاص انداز سے گردن کو ٹیڑھا کئے پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے تیز نظروں سے وارڈ کے مریضوں کو گھورتا ہوا کیبن کی طرف آتا تو میں آنکھوں پر اپنا ہاتھ رکھ کر خاموش ہو جاتی کہ وہ یہاں نہ آئے پھر بھی وہ کئی چکر ان کمروں کا لگا جاتا کہ کوئی تکلیف تو نہیں ہے۔ یہاں کی بے ترتیبی شور اور بے ہنگم لوگوں کا فضول آنا جانا اس کی نظروں میں کبھی نہ کھٹکتا اور خواہ مخواہ کی ہنسی ہنس ہنس کر اپنی زندہ دلی کا ایک بھونڈا سا ثبوت دیتا رہتا —!

میں خاموشی سے ٹھنڈے لوہے کے پلنگ پر اپنی انگلیاں کھٹکھٹاتی ہوئی اس کی باتیں سنتی اور جب وہ چلا جاتا تو دیر تک سوچتی رہتی میلے کپڑے گھناؤنے جسم اور کھردرے چمڑے والے، آخر کب تک وہ بھی انسان کہے جا سکیں گے؟ —!

اور اب سارا دن جیسے وارڈ کی مریضوں نے اطمینان کا سانس لیا تھا ہر طرف ایک رونق سی چھائی ہوئی تھی میرے کمرے کا پردہ ایک طرف سرکا ہوا تھا

اور میں بڑی دلچسپی سے انہیں دیکھتی رہی!

دوسرے دن جوتے کی پھر وہی آواز میرے پاس سنائی دی۔ اور میں نے اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا ——!

"آپ کا ٹمپریچر چارٹ کہاں ہے"؟ ایک نئی آواز سُن کر میں پلٹ گئی سفید ایپرن پہنے وہ کچھ چارٹ ہاتھ میں لئے کھڑا تھا"میں آج یہاں کا چارج لے رہا ہوں۔ ڈاکٹر انور بیمار ہو گئے ہیں،" وہ بڑی سنجیدگی سے بولا۔ اس کے چلے جانے کے بعد دیر تک گھنی پلکوں کے سایہ میں اس کی معصوم سی روشن آنکھیں میری نگاہوں میں گھومتی رہیں۔ میں اپنے پلنگ پر لیٹی اُسے کئی کئی چکر لگاتے دیکھ رہی تھی، ہاتھوں میں سرنج لئے اور کبھی موٹی موٹی دواؤں کی بوتلیں اٹھائے۔

میں کمرے کی تنہائی اور مسلسل خاموشیوں سے اُکتا گئی تھی۔ پلوریسی کا درد اور بخار میری روح کو کچل کر اچھا ہو چکا تھا کمزوریاں باقی رہ گئی تھیں۔ مگر ایک ہفتہ سے ادھر کبھی کبھی پھر بخار آنے لگا تھا۔ کرنل مہانی مطمئن تھے کہ وہ مجھے موت سے بچا چکے ہیں۔

اس کمرے کے سناٹے سے میرا جی گھبرا گیا تھا۔ میں چاہتی تھی کوئی مجھ سے باتیں کرتا رہتا اور میں اُسے یہ بتا دیتی کہ اتنے دنوں تک کتنے مشکلوں سے اکتائی ہوئی، چپ چاپ اور پریشان گھڑیاں کاٹ رہی ہوں۔ گھڑی کی ٹک ٹک زور سے سنائی دے رہی تھی اور میں بہت سی باتیں سوچتی ہوئی

سو گئی۔

جب میں تازہ ہوا کھانے کے لئے باہر لائی گئی تو ایک مسرور فضا سا ریے فیمیل وارڈ پر طاری تھی۔ کئی ملنے والے پلنگوں سے لگے بیٹھے ہوئے تھے۔ کوئی ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھی اور کتنی بچاریاں دل کھول کر کراہ رہی تھیں۔ وہاں پر سے میں نے گذرتے ہوئے، سرگوشیوں میں سنا "یہ بیچارا بے، منہ کا ڈاکٹر۔ دیوتا ہے دیوتا"——

میں اپنے کمرے میں تنہا لیٹی جلتی ہوئی روشنی کو دیکھ کر سوچ رہی تھی آخر کب تک ایسے ہی مضمحل اور افسردہ زندگی گذرتی رہے گی؟ — کبھی کبھی ایک محدود دائرے میں پہیّہ لگی کرسی پر آہستہ آہستہ گروش کرنا اور پھر بخار آجانے پر خاموش ہچکیوں کے سہارے لیٹی ہوئی دل کی تیز دھڑکنوں کے ساتھ مایوس دھندلے اور موہوم سے تصور——!

اور آج تو کوئی ملنے بھی نہ آیا تھا۔ میں کمرے سے باہر دیکھنے لگی۔ ڈاکٹر زیدی برآمدے کی روشنی میں کسی مریض کو دوا کھانے کا طریقہ بتا رہا تھا۔ وہ میرے کمرے میں بس ایک پل کے لئے آیا "آپ کا پہلا رپورٹ آگیا ہے۔ اس میں کالا آزار کا کیڑا تو نہیں نکلا، ممکن ہے فائیلیریا ہو مجھے آج آپ کا خون لینا ہے"—

رات بڑی افسردہ تھی ہسپتال کی راتیں بڑی بھیانک ہوتی ہیں پھر

جانے کیوں میرا دل صبح سے ہی بےچین سا تھا۔

سوتے سوتے میں یکایک چونک پڑی۔ زیدی شیشے کی پتلی پتلی تختیاں لیے کھڑا تھا۔ اس کی آنکھیں نیند سے بند ہوئی جا رہی تھیں۔ وہ میرا خون لینا چاہتا تھا۔ مگر اُس کی انگلیاں کانپ رہی تھیں میں ہنس پڑی۔ وہ مُسکرا کر بولا "یہ کیڑے بڑے شریر ہوتے ہیں رات گذرنے پر چھپ کے نکلتے ہیں نا۔ انہیں کسی ڈاکٹر پر افسوس نہیں آتا"۔ میں اپنی خاموشیوں سے اُکتا کر اس کے بالوں کی موجوں کو دیکھتی ہوئی شوخ لہجے میں بولی "کل سے اس سارے وارڈ میں دھوم مچی ہے، جانتے ہیں کیا — ؟ وہ جھک کر میرا خون لینے لگا تھا کہ مجھے تکنے لگا" یہی کہ اس وارڈ میں ایک دیوتا آگیا ہے"۔ "دیوتا؟" جی ہاں، ڈاکٹر انور کی تپتی ہوئی دھوپ کے بعد آپ ایک لطیف پھوار بن کر آئے"۔

وہ ہنسنے لگا "بچارا انور جب ہی تو بیمار پڑ گیا۔ اتنی بد دعائیں کیا ہوتیں آخر"—!

وہ میرا خون شیشے پر لگا کر میرے قریب ہی کرسی پر بیٹھ گیا "تو آپ بھی اُسے تپتی ہوئی دھوپ ہی کہتی ہیں؟ شیشے پر جھکی اس کی مُسکراتی ہوئی آنکھیں اور متبسم لبوں کو دیکھتی ہوئی میں ہنس دی یہ دھوپ؟ میں تو اُسے مٹی کا آتشیں آفتاب کہتی ہوں۔ اور آپ گہرا بادل بن کر اسے چھپا

ہوا ہی رہنے دیجئے" شیشے پر میرا خون خشک ہو گیا تھا وہ اس پر دوسرا شیشہ لگا کر ہنستا ہوا چلا گیا۔

میں نے اسے ڈیوٹی روم میں بہت مشغول دیکھا اس کے گرد ہر قسم کی مریض عورتوں کا ہجوم لگا ہوا تھا وہاں پر سے گذرتے ہوئے مجھے ہنسی آ گئی۔ دیوتا کے پجاری کس عقیدت سے اُس کی پرستش کر رہے تھے۔ اور سچ مچ بچارے زیدی کے دل میں غریبوں کیلئے بڑی جگہ تھی وہ ان کے دکھوں کو اپنی تکلیف سمجھ کر مضطرب ہو جاتا اور اسی لئے وہ سب کو پسند تھا اتنے دنوں تک کتابیں پڑھتے پڑھتے طبیعت اچاٹ ہو گئی تھی۔ اس گوشۂ ویران میں بس ایک بچارا زیدی ہی تو تھا اس کی باتیں بڑی دلچسپ ہوتیں دم گھٹنے والی تنہائیوں میں اس کی ہنسی غنیمت تھی اس سارے وارڈ میں ایس تھی بھی تو اس کی ہمخیال اور شاید اسی لئے اُسے بھی میری مسلسل باتوں سے دلچسپی ہو گئی تھی جب ہی وہ میرے کیبن میں کئی موٹی موٹی فائیلوں کو بیٹھا دیکھتا رہتا ــــ

کیبن کے سارے اخراجات مفت کے ہوتے بہترین کمرہ عمدہ کھانا خالص دودھ اور مقوی پھل۔ جنرل وارڈ کے ساتھ مفت کے کئی کیبن عام مریضوں کے لئے تھے۔ لیکن اس کے بند کمرے ہمیشہ مہذّب اور صاف ستھرے لوگوں کیلئے کھولے جاتے تھے اور وارڈ کے تمام نچلے لوگوں کی

کثرت سے گھبرا کے ڈاکٹر بھی یہیں آ کر سکون کا سانس لیا کرتے تھے۔

فائیلوں پر سر جھکائے زیدی اپنے ایپرن کی جیب سے انگور کے خوشے نکال کر مزے مزے میں کھاتا ہوا بولا " دیکھتی ہیں ؟ کیسے اچھے ہیں یہ انگور۔ مریضوں کے لئے خاص انتظام ہوتا ہے نا " وہ مسکرایا۔" لیکن عجیب بدقسمت ہوتے ہیں وہ بچارے بھی۔ جن کیلئے آتا ہے اُنہیں نصیب بھی نہیں یہ دیکھئے " اُس نے مجھے فائیل کے خانوں کو دکھاتے ہوئے کہا " یہاں عام مریضوں کے کھانے لکھے جاتے ہیں ، صبح کا ناشتہ اور دو وقت کے کھانے۔ اتنے کھانوں کیلئے جانتی ہیں ! فی کس روزانہ صرف دس پیسے ملتے ہیں "۔

یہی دس پیسے ؟ ۔ میں نے حیران ہو کر کہا ۔" جی ہاں بس اتنے ہی۔ لیکن آپ کیبن کے کھانے تو دیکھتی ہیں نا ۔ ؟ یہ جو اس طرف کے کیبن میں آئی ہیں وہ اس ملک کے سدھارنے والے ایک اعلیٰ عہدہ دار لیڈر کی بھانجی ہیں انہوں نے ہسپتال کے سپرنٹنڈنٹ کو لکھا ہے کہ کیبن میں کھانے دودھ اور پھلوں کا اور بہتر انتظام کیا جائے ۔ اُنہیں روزانہ صرف پھل دو سیر ملتے ہیں ۔ تو پھر یہ کہاں سے آئے ؟ اسی طرح کانٹ چھانٹ کر چلتا ہے کام ۔ اس نے میری چھوٹی سی الماری کو جھک کر دیکھتے ہوئے کہا ۔" آپ کو مل چکے پھل " ؟ ۔۔۔ اس وقت مجھ پر گھڑوں پانی پڑ گیا ۔۔۔ !

ہسپتال کی وحشتیں میرے کمرے کی خموشی، اور گاہے گاہے ماتم کا شور — بعض وقت تو ایسا لگتا جیسے ان مہیب آوازوں کے ساتھ رگ رگ سے میری روح نکلی جا رہی ہے۔

ایک دفعہ میرے سامنے سے اسٹریچر پر گذرتی ہوئی وہ مایوس اور متوحش نگاہیں میرے دل کی گہرائیوں میں پیوست ہو گئی تھیں۔ اور اسی رات سنسناتی ہوئی ہواؤں سے اس کی دم توڑتی ہوئی ہچکیاں ٹکرا ٹکرا کر صبح ہوتے ہی تھک کے ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئی تھیں۔ میں رات بھر سو نہ سکی۔ اس کی بے آس نگاہیں میری نظروں سے نہ ہٹتی تھیں۔ زیدی کے جوتے کی دبی دبی آواز بار بار سنائی دیتی وہ موت پر فتح پانا چاہتا تھا۔ گھڑی گھڑی کورامن کا انجکشن دیتے دیتے آخر وہ ہار گیا، مگر وہ بچاری "نرس نے صبح کا ٹمپریچر لیتے ہوئے بتایا کہ آخری گھڑی تک انجکشن کیلئے بیتابانہ اپنا ہاتھ دیتی رہی اور دوا پینے کیلئے وہ اپنے منہ کو حریصانہ طور پر مشکلوں سے کھولتی رہی، — چوڑی سیندور اور پھولوں سے سجی ہوئی اُس کی ارتھی جب میں نے دیکھی تو میری آنکھوں میں آنسو آ گئے اور جب زیدی کو دیکھا تو اُس کی نگاہیں بھی جھکی ہوئی اور افسردہ سی تھیں۔

مجھے چلنے کی جتنی اجازت ملی تھی میں اس سے کہیں زیادہ ہی ٹہلتی رہتی، بچپن سے میری خود سر فطرت بیماری کے اتنے طویل عرصے میں مجھ

باغی بنا چکی تھی اور تب میں نے سمجھا کہ ہسپتال کی یہ دنیا پلنگ پر لیٹ کر دیکھنے اور شیشہ لگی کواڑوں کی اُس تھوڑی سی نظر آنے والی جھلک سے کہیں مختلف تھی۔ میں نے کراہتے انسانوں کی چیخیں اور سسکتی ہوئی آہیں سنی تھیں۔ مگر ان بلبلاتے ہوئے لب، نکلتی ہوئی آنکھوں اور پھٹتے ہوئے جبڑوں کو دیکھ نہ سکی تھی، میرا کیبن جنرل وارڈ کے لمبے لمبے کمروں سے کچھ دور تھا کیبن کے سامنے دو بڑے بڑے کمروں میں کچھ صحت پا لینے والے مریض رکھے جاتے تھے لیکن جو وارڈ میرے کمرے کے پہلو میں تھا وہ خاص طور پر سیپٹک مریضوں کیلئے تھا اور اس سے لگا ہوا ایک چھوٹا سا کمرہ نرسس کیلئے ڈیوٹی روم بنا دیا گیا تھا۔ اس کے بعد دو چار کیبن اور تھے، پھر اسی طرح ان کمروں کے اُوپر دوسری عمارت تھی۔ کوٹھے پر عام طور سے تندرست مریض رکھی جاتی تھیں۔ اور اُن میں سے جہاں کسی کی حالت خطرناک ہوتی وہ لفٹ سے فوراً سیپٹک وارڈ میں بھیج دی جاتی۔ پھر وہ مریض عورتیں وہاں سے اچھی ہو کر سامنے کے وارڈ میں چلی جاتیں۔ یہ شاندار، شیشے اور بجلیوں سے جگمگاتی ہوئی عمارت قسم قسم کی مریض عورتوں سے بھری ہوئی تھی۔

سبز رنگ کی مخملیں گھاس پر گورنمنٹ میڈیکل کالج کے ہسپتال کی سفید عمارتیں ایک وسیع میدان میں گنگا کے کنارے کنارے بہت دُور

تک پھیلی ہوئی تھیں۔ ایک طرف لڑکوں کا کالج اور ہوسٹل تھے۔ اور اس کے سامنے مختلف بیماریوں کے لئے علیحدہ علیحدہ وارڈ پھیلتے چلے گئے تھے جہاں لوہے کے پتلے پتلے لاتعداد پلنگوں کے علاوہ نیچے فرش پر بھی اپنے گھر کے میلے کچیلے بچھاؤنوں پر طرح طرح کے مریض ڈاکٹری پڑھنے والوں کے لئے کھلی ہوئی کتابوں کے ٹیڑھے میڑھے حرفوں کی طرح رینگتے ہوئے نظر آتے تھے، کئی کئی گھنٹے ورجنوں لڑکے پھولا ہوا پیٹ، رکتی ہوئی سانسیں اور ڈوبتے ہوئے دلوں پر جھکے ہوئے لیکچر سنتے رہتے۔

ٹی۔بی، ہیضہ اور چیچک کا وارڈ کنارے پر تھا۔ اور اس کے بعد مردہ خانہ۔ ہسپتال کی سفید عمارتوں کے درمیان تھوڑے تھوڑے فاصلے پر ادھر اُدھر رنگا رنگ کے پھول کھلتے رہتے اور سفید و سرمئی کنکریٹ سڑکوں کے کنارے گھنے سایئے والے درختوں کے نیچے بھی ایک خاصا ہسپتال جما رہتا۔ جہاں کے مریض زیادہ بھیانک طور پر چلاتے اور بخار میں ہذیان بکتے۔

کرنل جہانی کے راؤنڈ کے بعد اور زیدی جب اپنے مریضوں میں گھرا ہوا ڈیوٹی روم میں مشغول رہتا تو میں ایسے وقت میں بار بستر نہیں ہوتی۔ نرس کو ڈھونڈنے کے بہانے میں سیپٹک وارڈ چلی جاتی وہاں زندگی اور موت، تکلیف و سکون کی گہری حقیقتیں میری آنکھوں کے سامنے

ہوتیں۔ زندگی کے عجیب عجیب نقشے، بنتی اور بگڑتی ہوئی صورتیں، بخار میں سر کو دھنتی، آنکھیں نکالے اور دانتوں کو پیستی ہوئی، مگر بے بس، پلنگ کی پٹیوں سے بندھی ہوئی مجبور ہستیاں۔ کہیں پر سسک سسک کر دم توڑتی ہوئی، اور کوئی بخار اُترنے کی کمزوری سے نحیف و نزار لیکن مطمئن اور مسرور۔

ڈیوٹی روم سے لگا ہوا ایک کمرہ تھا۔ جس سے اُسٹوو کے جلنے کی آواز ہر وقت سُنائی دیتی تھی۔ اس پر ساگودانہ اور بارلی پکتے ہوئے دیکھتی۔ جن مریضوں کو بخار رہتا انہیں ایک پاؤ دودھ آدھی ڈبل روٹی اور تھوڑا سا مکھن مل جاتا تھا۔ پھر ساگودانہ اور بارلی تو پکتے ہی رہتے تھے۔

عام طور پر سارے مریضوں کو صبح ناشتہ کیلئے سیاہ رنگ کا سوجی کا حلوہ گول گول لڈو بنا کر ایک ایک مل جاتا۔ گیارہ بجے دن اور چھ بجے شام کے کھانے میں کوئی فرق نہ تھا۔ پیتل کی بڑی تھالیوں میں موٹے چاول کے بھات، خوب ہلدیاں دی ہوئی پیلی پیلی اُبالی ہوئی دال، اور اس پر بینگن یا کوئی دوسری ترکاری مگر سیاہ رنگ کی، اکثر بالٹیوں سے کھانا نکالتے ہوئے مکھیاں اور مرے ہوئے جھینگر نکلتے پھر بھی گرسنہ نگاہوں کیلئے یہ بے فکری کے کھانے بڑے تسکین دہ ہوتے تھے۔ جس وقت کیبن والوں کو پھل دینے کیلئے اس طرف سے دائی ٹرے اُٹھائے ہوئے آتی تو کئی ترسی ہوئی بھوکی نگاہیں طشت کے کناروں سے آ کر

ٹکرا جاتیں۔

زیدی مجھے گھومتے ہوئے کئی بار دیکھ چکا تھا اور جب وہ ایک ڈاکٹر کی طرح مجھ پر سختی کرنی چاہتا تو میں اُسے مریضوں کی تکلیف دہ باتوں میں بہلا لیتی۔ وہ خود بھی اس دکھی دنیا کا شاکی تھا اور اس کی روشن نگاہوں میں دنیا کی تابانی کے خواب رقصاں تھے۔ وہ انسانی محنتوں سے ایک درخشاں تعمیر کا خواہاں تھا اُسے سوئٹزرلینڈ اور وائنا کی جگہ روسی ہسپتال زیادہ عزیز تھے اور وہ اس تڑپ سے کبھی کبھی تلملا جاتا تھا۔

زیدی عجلت کے ساتھ میرے کیبن میں آیا اور میز پر رکھے ہوئے سرنج میں دوا بھرنے لگا۔ وہ چڑچڑا اور بیزار سا دکھائی دے رہا تھا۔ دوا کی خالی شیشی زمین پر پٹکتے ہوئے بولا ایک تو دوائی ملتی نہیں اور ملتی بھی ہے تو بے حد گراں اور ہسپتال سے اب وہ مفت نہیں مل سکتی۔ پھر بھی یہ لوگ یہاں آ کر بے بسی کی موت مرنا کیوں پسند کرتے ہیں؟۔ سیپٹک وارڈ میں جا کر دیکھا تو بڈ نمبر ۱۱ کی حالت خراب تھی نرس نے بتایا کہ زیدی ابھی انجکشن دیکر شاید سنیما چلا گیا ہے۔

اتنے دنوں تک میں ہسپتال میں رہتے رہتے یہاں کی عادی ہو گئی تھی۔ زندہ رہنا مرجانا، پھر مرتے مرتے زندگی کو حاصل کر لینا میرے لئے کوئی اہمیت نہ رکھتا تھا۔ پہلے کی طرح کسی کو مرتے ہوئے دیکھ کر میرے

آنسو نہیں نکلتے میں موت سے نڈر ہو چکی تھی۔ اور زیدی جیسا مہربان ڈاکٹر میرے دل سے وحشتیں اور تنہائیاں دور کر چکا تھا۔ وہ موٹی موٹی فائیلوں کے خانے بھرنے کے علاوہ مجھ سے سوئیٹر بننا سیکھتا رہتا، پھر ہم دنیا بھر کی باتیں کرتے رہتے کبھی واقعات عالم پر تبصرے ہوتے، پرانی باتیں، اور بچپن کی شرارتیں۔ زیدی اپنے دن کی چھٹیوں کا سارا وقت میرے کیبن میں انہیں باتوں میں گذار دیتا اکثر ہسپتال۔ مریض۔ اور انور کی باتیں ہوتیں، اور کبھی بڑی سنجیدہ اور اہم گفتگو کرتے کرتے ہم دونوں الجھ پڑتے۔ مگر ہمیشہ یہی ہوتا کہ اس کی متبسم نگاہیں میرے چہرے پر جمی رہتیں اور وہ مسکراتا ہوا اپنے ایک خاص انداز میں کہتا "میں آپ کا ڈاکٹر ہوں۔ اور آپ بیمار ہیں نا۔ اچھا لیجئے مان گیا۔ اس وقت مجھے بڑی خوشی ہوتی کہ زیدی کے اتنے سارے مریضوں میں سے الگ تھی۔

ان دنوں سیپٹک وارڈ خطرناک اور مہلک مریضوں سے بھرا ہوا تھا اور موت کے سائے ہر طرف رینگتے ہوئے محسوس ہوتے تھے۔ بدمزا اوپر کے وارڈ سے یہاں بھیجدی گئی تھی۔ بخار کی بیہوشی اس سے کسی وقت دور نہیں ہوئی تھی اور اسی حالت میں اس کی سانس اکھڑنے لگی، وہ مر رہی تھی اس کی آنکھیں پتھرائی جا رہی تھیں اور ہچکیوں سے زرد ہوتے ہوئے اس کے لب کانپ رہے تھے۔ ڈاکٹر آکسیجن سلنڈر لگا گئے اس کے

سانس گن رہا تھا۔ باہر برامدے سے کمرے کے دروازے میں ایک برہنہ جسم مریضہ کے سرہانے جھکا ہوا رو رو کر التجا کر رہا تھا کہ خدارا کوئی دوا کھلا کر اس کی مرنے والی بیوی کو تھوڑی دیر کے لئے ہی ہوش میں لایا جائے تاکہ وہ اس سے اتنا پوچھ سکے کہ اس نے اس غریب کی ساری عمر کی کمائی کہاں گاڑ کر رکھ دی ہے، موت کی ہچکیوں کے ساتھ وہ بھی سسک رہا تھا۔ کل سے وہ بچارا اپنا سارا گھر کھود کر تھک کے مایوس ہو گیا تھا۔ ہچکیاں ختم ہو گئیں اور جب سُرخ کمبل سے لاش کا منہ ڈھانپ دیا گیا۔ تو وہ بڈھا اس کی پروا کئے بغیر روپوں کے لئے چیخیں مارتا چلا گیا۔

اور ایسے ہی ایک بڑھی ماں ایک دن اپنی جوان بیٹی کی لاش کے پاس سب سے رو رو کر التجا کر رہی تھی کہ کوئی اس کی بیٹی کے زیور اتار دے اُس کے پاس واپس گھر جانے کو پیسہ نہ تھا۔ وہ حسرت سے اپنی بیٹی کی لاش مردہ خانہ جاتے ہوئے دیکھ رہی تھی جو ابھی اس سے گھر جانے کی باتیں کر رہی تھی کہ یکایک ہارٹ فیل ہو گیا اسٹریچر پر سے اس کے بے جان ہاتھوں میں بازو اور کنگنے لٹک رہے تھے۔ بڑھیا منتیں کر رہی تھی۔ مگر زیور اُسے ابھی نہیں مل سکتے تھے۔ بڑھیا بلبلا کر رو پڑی جان اور مال دونوں گئے۔ مگر مال وہ تو زندہ تھا۔ وہ چیخ چیخ کر رونے لگی۔

سامنے وارڈ میں کچھ رونق رہتی، کبھی ہلکے ہلکے قہقہے اور گیت کا

دھیما دھیما راگ بھی سُنائی دیتا موت کے پنجوں سے چھٹ کر ان کے بھوکے نفس زندگی کی طرف حریصانہ طور پر دوڑ رہے تھے۔ اُبھری اُبھری ہڈیوں میں شگون کی چوڑیاں پہنی جارہی تھیں کوئی پھیری والوں سے کپڑے خریدتی اور کہیں آنکھوں میں کاجل اور بالوں میں سیندور لگائے جاتے تھے اس وارڈ کے پیچھے زیدی کا ڈیوٹی روم تھا اور اس کے بعد ایک اور اسی طرح کا وارڈ۔ یہاں بھی ویسے ہی زندگی کی ہماہمی شروع ہو چکی تھی۔ اس وارڈ میں بڈ نمبر ۱۷ کی مریض کو شہرت حاصل تھی۔ جو تیز تیز سوئیٹر بنتی ہوئی بنڈل سے ہندوستان کی اُلجھی ہوئی گتھیاں سلجھاتی رہتی۔ وہ جوان تھی اور تمکین صورت، اس کے ہاتھوں کے بنے ہوئے رومال، پر سُرخ گلاب کے پھول اور سبز رنگ کی پتیاں میں نے کئی ڈاکٹروں کی پتلونوں اور کوٹوں کی جیبوں سے نظر آتی ہوئی دیکھی تھیں۔ اور ایسے ہی ایک دن زیدی کی جیب میں سُرخ رنگ کا دھکتا ہوا گلاب دیکھ کر میری نگاہیں اس پر جم گئی تھیں۔ زیدی جھینپ کر کہنے لگا کہ "بعض مریضوں کو اپنی یاد قائم رکھنے کے لئے تحفہ دینے کی ایک عجیب تکلیف دہ عادت ہوتی ہے"۔

بارش کئی روز سے ہو رہی تھی اور ٹھنڈی ہواؤں سے پلوریسی کا درد دن بھر پریشان کئے ہوئے تھا۔ زیدی نے خود ہی سے انٹی فلوجسٹین کی پٹی لگا دی تھی۔ ساری رات میں نے بخار میں سُلگتے ہوئے جاگ کر کاٹی

تھی اور صبح کو سویرے ہی سے زیدی کی منتظر تھی۔ لیکن وہ کہیں پر نظر نہ آ رہا تھا۔ سامنے صحن میں ہارسنگھار کے شگفتہ پھول بکھرے ہوئے پڑے تھے۔ مجھے یہ پھول بے حد پسند تھے۔ ایک دن زیدی نے مجھ سے کہا تھا کہ اُس نے آج تک ہارسنگھار کے پھول کبھی دیکھے ہی نہیں ہیں۔ ایک لمبے عرصہ تک بیمار رہتے رہتے میں چڑچڑی ہو رہی تھی اسی لئے بخار سے اُکتا کر اس کی کچھ پروا کیے بغیر میں راؤنڈ سے پہلے ہارسنگھار کے تھوڑے پھول اور چند کلیاں ڈیوٹی روم کی میز پر چپکے سے رکھ آئی۔

بخار سے میری آنکھیں جلنے لگیں اور پلوریسی کا درد بہت بڑھ چکا تھا۔ راؤنڈ کا وقت ختم ہو گیا کرنل جہانی کہیں گئے ہوئے تھے اور زیدی کا کچھ پتہ نہ تھا، دن گذرتا جا رہا تھا اور میں ہر آنے والی آہٹ پر پلٹ کر دیکھتی رہی۔ کافی دیر ہو گئی اور میں زیدی کا انتظار کرتے کرتے تھک گئی۔ یکایک ٹرولی کے پہیوں کی آواز میرے کیبن کے پاس سے گذرتی ہوئی آئی اور اس کے ساتھ میں نے تیزی سے چلتے ہوئے زیدی کی ایک ہلکی سی جھلک دیکھی۔ وقت گذرتا گیا اور میں زیدی کے آنے سے مایوس ہو گئی۔ ملنے والے عزیزوں کے افسردہ اور لٹکے ہوئے چہرے دیکھ کر اتنے دنوں بعد محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے موت کے پنجوں میں سسکتا ہوا مجھے بے بس چھوڑ دیا گیا ہے۔ پہلے پلوریسی کے درد اور تڑپ کے ساتھ مجھے موت سے ڈر لگتا تھا۔ اور میں

حیات کی آخری منزلوں تک جینا چاہتی تھی مگر اب موت کے سکون میں زندگی کی انتہا دیکھ کر، درد سے تنگ آکر، جینے کی آرزومند نہ تھی۔

شام سے میرا بخار بہت بڑھ گیا تھا۔ نرس اسٹاف کو بلا کر لے آئی برف کی ٹوپی میرے سر پر رکھ کر وہ میرے پاس ہی بیٹھ گئی جانے کیوں، وہ مجھ پر اتنی مہربان کیسے تھی۔ کالی سی صورت، سوکھی سوکھی ٹانگوں پر تنگ پاجامہ سفید فراک پہنے اور سر پر چوڑا سا رومال باندھے وہ اپنے کو ہر نوجوان ڈاکٹر کی نگاہوں کا مرکز سمجھتی اور ان دنوں وہ اپنے تیر زیدی پر چلا رہی تھی۔ اس کی خواہ مخواہ کی اچک اور مہمل بے سُرے گانوں سے مجھے بڑی چڑ تھی۔

وہ طنزیہ ہنسی ہنستی ہوئی بولی "ڈاکٹر۔ آج سارا دن ایک کیس کے پیچھے پریشان رہا۔ اگزامینیشن اور ایکس رے کے بعد وہ میجر چندر اور کرنل مہانی کے گھر دوڑتا رہا ہے۔ مگر کوئی نہ ملا۔ چندرا کول میں گئے ہوئے ہیں اور کرنل کہیں مدعو ہیں۔ اپنڈے سائٹیس کا اتنا کمزور کیس بچارا زیدی بڑا پریشان ہے وہ میری طرف دیکھ کر زور سے ہنسی "اور صورت کیسی ہے اس لڑکی کی فقیرنی جیسی، مگر شاید آنکھیں اچھی ہیں، جس گھڑی سے وہ آئی ہے بس ڈاکٹر کے چہرے ہی پہ تو اس کی نگاہیں جمی ہوئی ہیں، اور اس کے ساتھ گنوار جیسے لوگ کتنے ہیں شور کرنے والے!" اس کی آنکھیں خوشی سے چمک رہی تھیں وہ جھک کر میرا ٹمپریچر لیتے ہوئے بناوٹی ہمدردی

سے کہنے لگی "تو کیا آج سارا دن ڈاکٹر آپ کو دیکھنے تک نہ آیا؟ اُسے ایسا تو نہ کرنا چاہئے تھا پیشنٹ کو کیا ہو جائے گیا نہیں، ایسا بھی نہیں کرتے" فلو جسٹین کی پٹی ٹھنڈی ہو کر میری پیٹھ میں چبھ رہی تھی۔ اور میں بے آسرا بیمار اُکتائی ہوئی ایسی حالت میں گھر چلے جانے کی باتیں سوچتی رہی میری سانسیں تیز تیز چلنے لگی تھی اور جلتی ہوئی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ جانے ایسے ہی میں کب سو گئی تھی کہ اچانک ٹرالی کی آواز سُن کر میں جاگ اٹھی۔ آدھی رات گئے کوئی کیس اپریشن روم میں جا رہا تھا۔

بخار سے میرا حلق اور میری کنپٹیاں پھڑک رہی تھیں اور درد کی تکلیف سے میری روح گھٹتی جا رہی تھی اپریشن روم سے ایتھر کی تیز مہک آئی اور میری آنکھیں خود سے خود بند ہو گئیں۔

درد کی ٹیس سے سویرے ہی میری نیند ٹوٹ گئی، سامنے لٹکتے ہوئے ٹمپریچر چارٹ میں سانس کی رفتار اور بخار کے گول گول سُرخ اور سیاہ نقطے بڑے بڑے اونچے اونچے ٹیڑھے ترچھے کھنچے ہوئے تھے۔ باہر برآمدے سے ماتم کرنے اور رونے کی پُر شور آواز آ رہی تھی۔ نرس مجھے ہار سنگھار کے پھول دے رہی تھی کہ میرے دروازے کا پردہ ہٹا اور رندیدی تھکاوٹ سے چور کمرے میں آیا اس کی پیشانی پر بال بکھرے ہوتے اور کپڑے سلوٹوں سے بھرے اور میلے ہو رہے تھے۔ اس کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔ اُس

نے ڈوبتی ہوئی آواز سے کہا "نرس روم نمبر ۵ میں جا کر آکسیجن سلنڈر اب ہٹا دو" زیدی میرے پاس ہی اک ہارے ہوئے جواری کی طرح اپنے سر کو ہاتھوں سے تھامے خاموش بیٹھا رہا، اس کی نیند سے بند ہوتی ہوئی نگاہیں بہت دُور دیکھ رہی تھیں۔ درد سے تڑپتے ہوئے اس وقت مجھے ڈاکٹر انور یاد آ رہا تھا جو کیبن کے مریضوں کو اس طرح کبھی نہ بھلا سکتا تھا، میری جلتی ہوئی مایوس نگاہیں اسے ڈھونڈھ رہی تھیں، مجھے خود پر غصہ آ رہا تھا۔ زیدی آخر مجھے اس سے اتنی امید ہی کس لئے تھی۔ وہ تو سب ہی کا تھا سارے ہی اس کے تھے۔ میں اپنی تڑپتی ہوئی کراہوں کو روک نہ سکی، زیدی یکایک جیسے خواب سے چونک کر بولا "میں کل نہ آ سکا ایک کیس آ گیا تھا، اپنڈے سائٹیس کا خطرناک اور مہلک کیس۔۔ آخری دم تک، دو ملتجی اور کمزور نگاہیں مجھ سے اپنی زندگی کی بھیک مانگ رہی تھیں، کرنل مہانی کہیں مدعو تھے، اور میجر کول میں ——! اگر دونوں میں سے کوئی بھی ہوتا —— مہانی . . . پارٹی میں نہ جاتے.... تو یقینی ایک زندگی بچائی جا سکتی تھی! کاش میجر ہی ہوتے" —— وہ ایسے بول رہا تھا جیسے بیہوشی کے بعد ہوش میں آتے ہوئے کوئی لڑکھڑا کر بلا سمجھے ہوئے آپ ہی آپ بول رہا ہو۔ "بیہوشی سے پہلے اُس نے اپنی ٹھنڈی ٹھنڈی انگلیوں سے میرا ایپرن پکڑ کر کہا تھا۔ کہ میں اُسے کسی طرح بچا لوں، اگر مہانی پارٹی میں نہ جاتے تو وہ بچ سکتی تھی۔ اس کا اپریشن ضرور کامیاب ہوتا۔ میں نے سب سے پہلی بار ایک زندگی

کو موت کے جبڑوں سے چھیننے کی انتہائی کوشش کی تھی لیکن میرا اپریشن ناکامیاب ثابت ہوا، اور ایک فاقہ زدہ تھکی ہوئی زندگی موت سے جیت نہ سکی۔ "پہلی بار" — درد کی تکلیف سے میں کانپ رہی تھی اور میرے دماغ کے گوشوں میں جیسے گونج رہا تھا "پہلی بار" اس وقت نفرت کی ایک تیز لہر میرے دل میں اٹھی۔ "روز ہی مرتے رہتے ہیں کتنے، اگر ایک فقیرنی جیسی مرگئی تو کیا، میں تو خود مر رہی تھی"۔ زیدی کی آنکھوں سے آنسو چھلکنا چاہتے تھے وہ انہیں چھپانے کی خاطر سامنے دیوار پر میرے بخار کے چارٹ کو دیکھ رہا تھا۔ مگر شاید بخاروں کے اونچے اونچے نقطے اسے نظر نہ آرہے تھے، تکلیف اور بخار سے میرا جی بیٹھا جا رہا تھا اور زیدی کو دیکھتے ہوئے میری چڑچڑی طبیعت ماتم کا شور سُن کر ہلکی ہلکی لگ رہی تھی —

کیبن کے ٹھیک سامنے سبز سبز پتوں میں ہار سنگھار کی کلیوں کو ہواؤں سے جھومتی ہوئی میں دیکھ رہی تھی، چمکتی ہوئی دھوپ میں زمین پر نازک نازک پھول کمھلائے ہوئے پڑے تھے اِن شاداب ڈالیوں میں ہر روز ہی نئی نئی کلیاں لگتی رہتی تھیں اور سارا دن کتنے ہی شگفتہ پھول آفتاب کی ان زرد کرنوں سے مرجھاتے رہتے تھے، مگر اچانک اس وقت میرے دل میں ایک تڑپتی ہوئی تمنّا پیدا ہوئی "کاش ایسا نہ ہوتا۔ ایسا نہ ہوتا۔"

# بزُدل

سائے تاریک ہوتے جا رہے تھے اور وہ بے بسی سے اسی اندھیرے میں گھُٹ جانا نہیں چاہتی تھی۔ اُسے محسوس ہوتا جیسے کسی اتھاہ سمندر میں لاحاصل ہاتھ پاؤں مار رہی ہے۔ ساحل کا کوئی پتہ نہیں، اور اُسے تیرنا نہیں آتا۔ اُس کا تھکا ہوا جسم شل ہوا جا رہا تھا اور اُسے یوں لگ رہا تھا کہ پانی کی سطح پر یہ چند اُبھرتے ہوئے بُلبلے بھی جلد ہی ہمیشہ کے لئے مٹ جائیں گے اور ہر طرف تاریکیاں ہی باقی رہ جائیں گی۔

اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں کبھی کبھی اس کی نگاہوں کے آگے بجلیاں سی

کوند جاتیں۔ مبہم امید کی چند کرنیں اُس کے دل کی درزوں میں سے جھانکتیں۔ کچھ مدھم سے نقوش اُبھرتے۔ اُسے دھندلا دھندلا خواب سا یاد آتا اور جب اس کا دل بُری طرح گھبرانے لگتا تو وہ انہی مٹتے ہوئے نقوش کو اپنی نگاہوں کے موٹے قلم سے تخیل کے پردے پر اُبھارنے لگتی۔ پھر وہ رنگینیوں میں ڈوب جاتی کیفِ خمار کے اوّلیں احساس میں جذبات سے دبی ہوئی پہلی پہلی لذتیں اسے یاد آتیں۔ جب وہ ایک سرور محسوس کرنے لگی تھی اس نے زیدی کو پہلی بار دیکھا۔ پہلے وہ اس نوائے سروش سے بے خبر تھی۔ جو زیدی کی نگاہیں اسے سُنا رہی تھیں۔ اس نے کچھ نہ سمجھا کہ دُنیا اتنی حسین کیوں ہو گئی ہے۔ مگر رفتہ رفتہ اس نے محسوس کیا۔ اور یکایک چونکی مگر سنبھل نہ سکی۔ زیدی بہار بن کر آیا اور اس پر چھا گیا۔ شمع اپنے دل کی پُر خلش لذتوں کو چھپائے زیدی سے ملتی رہی۔ پہلے خاموش خاموش کھنچی کھنچی سی۔ جھکی ہوئی پلکوں سے وہ بس اتنا ہی محسوس کر کے خوش ہو لیتی کہ زیدی ابھی اس کے پاس ہے مگر وہ کچھ زیادہ دنوں تک اپنی دلی کیفیتوں کو چھپا نہ سکی۔ طوفان کی رو میں ڈالیاں جھومے بغیر کیسے رہ سکتی تھیں۔ اُس نے کچھ نہ جانا کہ اسے کیا کرنا ہے اور اس خود فراموشی کی حالت میں وہ کچھ جاننا بھی نہ چاہتی تھی۔ والہانہ طور پر اُسے خیال ہوتا کہ زیدی اس سے محبت کر رہا ہے۔ پھر بھی وہ اپنی روح میں ایک خلا محسوس کرتی، جیسے اسے کسی چیز کا انتظار ہو۔ شمع نے انجان رہ کر محسوس کیا تھا کہ زیدی اکثر کئی کئی بہانوں سے

اُسے ملنے آتا ہے۔ ایک بار سنگر مشین پر جھکی ہوئی وہ کچھ سی رہی تھی۔ ہینڈل زور زور سے چل رہا تھا۔ اسے اس تنہائی میں بہت سی باتیں یاد آ رہی تھیں۔ جس طرح سلتے ہوئے کپڑے تیزی سے پیچھے بھاگتے جا رہے تھے اسی طرح اس کی آنکھوں کے آگے سے بھی کتنی ہی یادگار باتیں گذرتی جا رہی تھیں۔ وہ مشین کو اور بھی تیز تیز چلانے لگی۔ اس کے جسم کے ہر ہر بند اور ہر ہر جوڑ میں ایک طوفان بپا تھا۔ وہ مشین کو اتنے زور سے چلانا چاہ رہی تھی کہ اُس کے پُرزے اپنی جگہ سے ہل ہل اُٹھیں۔ اُس کا دل ایک سیلاب کی طرح اُمڈ آنا چاہتا تھا اور وہ ساحل سے ہم آغوش ہو جانے والی لہروں کا ترنم سننے کو بیتاب تھی۔ وہ گھبرائی گھبرائی خوفزدہ سی رہتی۔ پھر بھی کبھی کبھی اس کا دل مسرور ہونے لگتا۔ اور اس کی نگاہیں ایک خوش آگیں خواب دیکھنے لگتیں، کبھی دھندلا اور کبھی صاف، روشن چمکیلا سا خواب۔

وہ مشین پر جھکی، زور سے ہینڈل چلاتے چلاتے تھک گئی تھی۔ اس کے کندھوں میں درد ہونے لگا تھا۔ اُس نے سر اُٹھا کر اپنے گرد گہری خاموشی کو محسوس کیا اور تنہائیوں سے اُکتاتے ہوئے مشین کو پھر تیز تیز چلانے لگی۔

مکان کے ایک حصّہ سے گھر کے لوگوں کی ملی جُلی آوازیں آ رہی

تھیں۔ کبھی کبھی گفتگو کا کوئی دلچسپ حصّہ بھی سُنائی دیتا، وہ اسی طرح اپنی سلائی میں مشغول تھی دوسرے کمرے میں اس کا بھائی خاموشی سے اپنی کتابوں میں غرق تھا، کمرے میں داخل ہوتے ہوئے سفید پینٹ کی مہری اور سیاہ بوٹ اسے نظر آیا۔ مگر وہ سر جھکائے اسی طرح سیتی رہی۔ زیدی کی آواز سُن کر شمع چونکی وہ کہہ رہا تھا کہ "رات اپنی آنے والی کتابوں کی رسید وہ شاید یہیں کہیں بھول گیا ہے" چکّر لگاتا ہوا ہینڈل اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اس کے بازو میں اینٹھن ہونے لگی۔ زیدی اس کے قریب ہی آکر بیٹھ گیا۔ سِلے ہوئے کپڑے کو اُلٹ پلٹ کر وہ ہنستے ہوئے شمع سے کہنے لگا کہ" وہ اس سے کہیں بہتر سلائیاں کر سکتا ہے" پھر مشین کو چلاتے ہوئے بولا کہ کالج کے بعد وہ ایک ٹیلرنگ ہاؤس کھولے گا۔ جہاں طرح طرح کی سلائیاں ہوں گی" ہینڈل زور سے چکّر لگا رہا تھا۔ سلائی ٹیڑھی میڑھی ہو رہی تھی اور کپڑا مشین کے دانتوں سے بہکا جا رہا تھا، گھر گھر کی تیز آواز گونج رہی تھی۔ تھوڑی دیر میں زیدی چلا گیا۔ شمع نے اپنے دل کو یقین دلانا چاہا کہ زیدی صرف اس سے ملنے کے لیے آیا تھا، زیدی نے جاتے ہوئے کہیں پر بھی اپنی کتابوں کی رسید نہیں ڈھونڈی تھی، شاید وہ یہی بتانے آیا تھا کہ اس کی رُوح میں بھی ایک زلزلہ آچکا ہے۔ مگر شمع چاہتی تھی کہ

زیدی اسے یہ بتا دے کہ وہ اس کو بغیر دیکھے ہوئے نہیں رہ سکتا۔ وہ اکثر سوچتی "کیا یہ سچ ہے"۔ وہ جیسے تاریکی میں کسی چیز کی متلاشی تھی۔ پھر بھی اس کے دل کو غائبانہ طور پر محسوس ہوتا کہ زیدی اس سے محبت کر رہا ہے، وہ اس کی نگاہوں کو ٹٹولتی، اس کی ہر ایک کیفیت کو دیکھتی اس کی ساری باتوں پر غور کرتے ہوئے اُسے کسی چیز کو پا لینا تھا۔ کبھی کبھی زیدی کی خاموش نگاہوں کی گہرائیوں میں اس کے دل کا سراغ ملتے ملتے رہ جاتا اور اسے ایسا لگتا جیسے "لگا چوری" کھیلتے ہوئے وہ اپنا گھونٹا چھوتے چھوتے رہ گئی ہو۔

وہ زیدی کی خاموش نگاہوں کی خلش کو محسوس کرتے ہوئے بھی اس کی محبت کے بیتابانہ اقرار کی خواہشمند تھی، وہ نہیں جانتی تھی کہ اُس کا دل کیوں صرف اتنی سی بات، لبوں کی ایک ہلکی سی جنبش اور تھرتھراتے ہوئے لفظوں کی تھوڑی سی پُر معنی گونج سننے کے لئے بے چین ہے۔ بس اسے اتنا معلوم تھا کہ اُس کی رُوح مضطرب ہے، بعض دفعہ وہ اپنی اس لطیف محبت کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبتی ہوئی اس کی تھاہ لینے لگتی تو پھر اُسے یوں لگتا جیسے وہ تپتے ہوئے صحرا میں اکیلی بھٹک رہی ہے۔ وہ کچھ سمجھی اور کچھ سمجھنے کی کوشش ہی کر رہی تھی کہ اچانک طور پر زیدی اس سے جُدا ہو گیا۔ ایک لا محدود

عرصے کے لئے وہ چلا گیا ــــ ؟ دل کی گہرائیوں میں بے تابانہ خلش بار بار اس سے سوال کرتی "کیا زیدی کو اس سے کوئی لگاؤ بھی نہ تھا، کوئی اُنس تک نہیں"؟ اور جب کچھ بھی نہ تھا تو پھر اس طرح وہ یکایک چلا کیوں گیا؟" شمع نے اسے شاید غلط سمجھا تھا۔ وہ تھوڑی سی باتوں کو اپنی نگاہوں کی بھول تو سمجھ لیتی مگر وہ زیدی کی کتنی باتوں کو بھلا سکتی تھی، رُوح اور دل کے ٹکراؤ کی جھنکار سے کھیلنے والے زیدی کو وہ کبھی یاد نہ رکھنا چاہتی تھی۔ مگر جب زیدی اس سے دُور جا چکا تھا۔ تب شمع نے سمجھا کہ وہ کنارے کی کس حد تک پہنچ چکی ہے۔

جیسے گھر بھر سے الگ تھلگ ننھی لڑکیاں ایک کونے میں بیٹھی طرح طرح سے اپنی گڑیاں سنوارتی رہتی ہیں۔ ٹھیک اسی طرح شمع اپنے افسانے اور اپنی نظموں کی رنگین دُنیا میں مسرور تھی، وہ مصوّر نہیں تھی مگر اپنے ادب کے پردے پر زیدی کی کتنی ہی بولتی ہوئی تصویریں بنا چکی تھی۔ جب وہ اپنی تنہائیوں سے گھبرا جاتی تو صرف اپنے کو بہلانے کے لئے افسانے لکھتی، شوخ رنگین اور رومانی افسانے، جہاں زیدی خاموش نہ رہتا، اس کی رُوح کا خلا بھرتا جا رہا تھا، اس نے اپنے سکون کی دُنیا تلاش کر لی تھی، گذری ہوئی نگاہوں کی داستانِ مسلسل اور خاموشیوں کی ایک ہی تھکا دینے والی یاد سے وہ تنگ آ چکی تھی، اب جیسے بھی اس کا جی چاہتا زیدی اس سے باتیں

کرتا رہتا، گھنٹوں طرح طرح کی باتیں۔ ادب کی لامحدود دنیا اس کے سامنے تھی اور اس کے افسانے فردوس بداماں تھے اس نے اپنی تڑپتی ہوئی روح کو بروما نٹڈ اور اسپرو دیکر بہلانا چاہا اور وہ کسی حد تک کامیاب بھی ہو گئی تھی۔

ایک طویل عرصہ گذر گیا۔ شمع کی نگاہوں میں اب زیدی کا تصور بھی دھندلا ہوتا جا رہا تھا۔ کبھی کبھی کافی دیر تک وہ زیدی کی کبھی کی دیکھی ہوئی صورت کو یاد کرتی۔ مگر اس کو خواب میں دیکھے ہوئے ایک مبہم عکس کے سوا کچھ بھی یاد نہ آتا۔ پھر بھی وہ زیدی کو بھلا نہ سکتی تھی، گذرے ہوئے ایک ایک دن اس کے افسانوں میں یادگار بن چکے تھے مگر جیسے کلوروفارم کی بیہوشی کے بعد ہوش میں آتے ہوئے شدید تڑپ کا احساس ہوتا ہے، اسی طرح اپنے رنگین افسانوں سے اکتا کر شمع کا دل مضطربانہ چیخ اٹھتا "کاش کبھی تو ایسا ہوتا!" پُر خلش حسرتوں کے ساتھ بھی وہ اپنے ادب کی رنگین دنیا سے الگ نہ ہو سکی اس کی تسکین کا بس یہی تو ایک سہارا تھا۔ اور اس سہارے کے بغیر وہ کیا کرتی!

یکایک شمع نے ایک تکلیف دہ حقیقت کو محسوس کیا۔ اس کے اپنے افسانے کے عزیز ترین زیدی کی ٹھیک اسی طرح ایکٹنگ کرتا ہوا تنویر اس کی روح پر چھا جانا چاہ رہا تھا۔ وہ شمع کا ایک دور کا عزیز تھا۔ شوخ طراز

فلمی گانوں کا شوقین، اپنی دلی تمناؤں کی طرح طرح سے نمائش کرنے والا، بے
جھجک تنویر تیزی سے اس کی طرف بڑھتا ہوا چلا آرہا تھا۔ شمع کے رنگین افسانوں
کے شوخ کردار سے شاید اسے غلط فہمی ہوئی تھی۔ تنویر کو ادب سے کوئی لگاؤ نہ
تھا۔ مگر جب سے اس نے زیدی کی تصویر سے اپنے قہقہوں کی گونج سنی تھی تب
سے وہ ادب نواز بن گیا تھا۔ وہ شمع کے تنہائیوں میں دیکھے ہوئے خوابوں کی
تعبیر بننے کیلئے روز نئے نئے سوٹ پہن کر آتا۔ شمع کو کبھی اس سے کسی قسم کی
دلچسپی نہ رہی تھی۔ مگر تنویر کو کسی پذیرائی کی ضرورت نہ تھی۔ وہ شمع کے افسانے
پڑھ کر ساری باتوں کو سمجھ چکا تھا۔ تنویر کی رنگین ٹائیوں کو دیکھتے ہوئے
شمع کا دم اُلجھنے لگتا جیسے ٹائی کی گرہ خود اس کی گردن میں پیوست ہوئی جا
رہی ہے۔ شمع نے کبھی تنویر کی پیشکش کو قبول نہ کیا۔ اس کو تنویر سے ایک
چڑ سی ہو گئی تھی۔ مگر تنویر ایک سطحی بُلبلا تھا وہ شمع کے دل کی گہرائیوں کو کیا
جان سکتا تھا۔ تنویر، شمع کی زندگی کے لئے ایک نشتر بن گیا تھا، وہ اس
صورت میں زیدی کو بھلا بھی تو نہ سکتی تھی۔ آخر تنویر سے چڑ کر اس نے لکھنا
بند کر دیا، اسے اپنے افسانوں سے خود ہی وحشت ہونے لگی تھی، اپنے بنائے
ہوئے کھلونے بھی اس کے اپنے نہ رہے تھے، وہ اکیلے میں خود کو تسکین دینے
کے لئے ڈائری لکھنے لگی، زیدی کی شوخ بولتی ہوئی نقلی تصویر بنا کر اس
نے اپنے آپ کو فریب دینا چاہا تھا مگر کامیاب نہ ہو سکی۔ اس دفعہ وہ رنگین

برشوں کو پھینک کر پنسل اسکیچ سے ہو بہو زیدی کی تصویر بنانے لگی۔ اب اُسے ایک گونہ قرار ملا تھا۔ وہ تنویر سے انتقام لے کر خوش تھی مگر تنویر ان باتوں سے بے خبر تھا۔ اس کی آنکھیں کتنی ہی فلموں کو جذب کر چکی تھیں۔ اس نے اِس روٹھی ہوئی منزل کے اَن گنت مناظر دیکھے تھے۔ اُسے ہر گھڑی ہر موسم کے فلمی گانے یاد تھے جنہیں یاد کرنے کیلئے اس نے کالج کے لیکچروں سے زیادہ اہمیت دی تھی۔

خاندان کا ایک فرد ہونے کی حیثیت سے تنویر کو ہر طرح کی آزادی تھی۔ چھوٹی چھوٹی باتوں میں اس کی شرکت ضروری سمجھی جاتی۔ وہ لوگوں کی دلچسپیوں کا مرکز تھا۔ طرح طرح کے لطیفے اور قسم قسم کے گانوں سے وہ ہر دلعزیز بن چکا تھا۔ رفتہ رفتہ وہ شمع کے گھر پر چھا گیا اور شمع اپنی اُمید کے چراغِ شکستہ کی مدھم کرنوں کو ایک ایک کر کے مٹتے ہوئے بے بسی سے دیکھ رہی تھی۔ اندھیرے بڑھتے ہوئے آ رہے تھے اور شمع آہستہ آہستہ ان تاریکیوں میں غرق ہوتی جا رہی تھی۔

شمع گھر کے سارے لوگوں کے ساتھ گنگا کے اس پار بوٹنگ میں گئی مگر تنویر کی محبت کے بیجا اظہار سے چڑ چڑی ہو کر وہ جلد ہی وہاں سے اکیلی لوٹ آئی اپنے کمرے میں جاتے ہوئے اُسے یک بیک خیال ہوا زیدی کئی بار یہاں پر سے گذرا تھا۔ اور اب وہ اس وقت کہاں ہوگا! تنویر نے جیسے اس

کے دل کے زخموں کو اپنے ناخن سے کھرچ دیا تھا۔ جب وہ کمرے کے اندر پہنچی تو بجلی کی تیز روشنی میں اچانک اس کی آنکھیں جگمگا اٹھیں اس کو اچھا سا لگا۔ وہ دیر تک دیکھتی رہی۔ اُس کی متحیر بھوکی نگاہیں زیدی کو ہمیشہ کے لئے اپنے میں جذب کر لینا چاہتی تھیں۔ وہ بالکل پہلے جیسا تھا۔ وہی مخصوص پرانی مسکراہٹ ابھی تک اس کے لبوں پہ کھیل رہی تھی۔ مگر نگاہیں پہلے سے کچھ بے باک اور شوخ نظر آ رہی تھیں۔ وہ زیدی سے ملنے میں ذرا بھی نہ گھبرائی۔ اُسے اپنی پہلی چوک یاد تھی وہ اپنے افسانوں میں ان راستوں سے ہوتی ہوئی کہیں آگے تک پہنچ چکی تھی وہ بے جھجک مسلسل باتیں کرتی ہوئی یہ بتا دینا چاہتی تھی کہ وہ اتنے عرصے میں کتنی بدل چکی ہے۔

زیدی شمع کا مہمان تھا اُسے اپنے کالج سے کوئی سرٹیفکیٹ لینا تھا۔ شمع اپنے ہاتھوں سے جب زیدی کی ساری چیزیں ٹھیک کر چکی تو دیر تک غیر شعوری طور پر وہ زیدی کی ٹائی سے کھیلتی رہی۔ خواب اور بیداری کے درمیان اس کا دل تیز تیز دھڑک رہا تھا۔ گھر کے سارے لوگوں نے بڑی خوشی سے زیدی کو خوش آمدید کہا۔ زیدی کی خاموشی اب دور ہو چکی تھی وہ دیر دیر تک دلچسپ باتیں کرتا رہتا۔ زیدی نے تنویر کے گانے سُنے اور گھر کے دوسرے لوگوں کی طرح وہ بھی تنویر کا دوست بن گیا۔

شمع دور رہ کر زیدی کی نگاہوں کو محسوس تو کر رہی تھی، وہ دیکھتی تھی کہ زیدی

دوسرے لوگوں سے مل کر اس سے باتیں کرلیتا ہے مگر وہ تنہائیوں میں شمع سے بولنے میں لڑکھڑانے لگتا۔ شمع اس کے کمرہ میں جاکر اس کی ٹائی اور بنیٹ سے کھیلتی ہوئی جب طویل گفتگو چھیڑ دیتی تو زیدی کا گھبرایا گھبرایا پریشان سا چہرہ دیکھ کر اُسے ہنسی آجاتی۔ اکیلے میں چپ چاپ زیدی کی ساری چیزوں کو اُلٹ پلٹ کر وہ دیکھتی رہتی اسے زیدی کی ہر ایک چیز سے پیار لگتا اور وہ ان چیزوں میں زیدی کی گہری پوشیدہ محبت کا سُراغ ڈھونڈنا چاہتی تھی مگر کہیں نہ پاسکی۔

اپنے چھپے ہوئے افسانوں کے سارے پرچے اس نے ایک دن زیدی کے میز پر رکھ دیئے اور دوسرے دن جب زیدی کو صُبح بخیر کہنے گئی تو وہ اسے دیکھتے ہی مسکرا کر بولا "اب تو آپ بہت بڑی افسانہ نگار بن گئی ہیں" شمع چونک اُٹھی اس کے جذبات کا سیلاب ایک دھارا بن کر رستے ہوئے دراڑوں سے بہہ نکلا تھا۔ وہ زیدی کو تکتے ہوئے ہنس پڑی "یہ افسانے نہیں ہیں زیدی صاحب۔ اپنے لئے کچھ کھلونے بنائے ہیں میں نے"

"کھلونے" —— ؟

"ہاں۔ میں اُن سے کھیلتی ہوں جب میرا جی بہت گھبرانے لگتا ہے تب۔"

"مگر کہاں سے لاتی ہیں اتنے سارے کھلونے ؟" زیدی نے حیرت سے پوچھا۔

"میں نے افسانہ لکھتے ہوئے کبھی کچھ نہیں سوچا۔ گذری ہوئی باتیں یاد آتی گئیں۔ اور لکھتی گئی —— آپ اُنہیں افسانے کہتے ہیں ؟ اور میں کہتی ہوں میرے کھلونے ہیں

یہ۔" وہ ایک خود فراموشی کی حالت میں بولتی چلی گئی۔

کیسے اتنی باتوں کو یاد کر کے لکھ لیتی ہیں آپ؟ میں تو جب کبھی کچھ سوچتا ہوں تو عجیب حالت ہو جاتی ہے میری۔ سارا جسم تپتا ہوا گرم گرم محسوس ہوتا ہے اور پھر میں پسینے سے بھیگ جاتا ہوں۔ اسی لئے کچھ یاد کرتے ہوئے بھی میں ڈرتا ہوں۔ کس سے؟ یہ نہیں جانتا۔ شاید خود ہی ڈر جاتا ہوں۔ میں —" زیدی کی آنکھیں بہت کچھ کہنا چاہ رہی تھیں۔ اس کا چہرہ اس وقت بھی تمتمایا ہوا تھا، شمع دیکھ رہی تھی کہ جیسے اب وہ اپنی منزل پر پہنچ رہی ہو — وہ بہت کچھ سننے کو بے تاب تھی۔ مگر زیدی خاموش ہو چکا تھا — وہ اپنے قریب ہی تنویر کی آواز سن کر چونکی۔ تنویر کی مسکراتی ہوئی آنکھیں اُسے فاتح نظر آرہی تھیں، شاید اس لئے کہ زیدی کچھ نہ بول سکا تھا۔

ایک روز تنویر زیدی کو اپنے ساتھ لئے ہوئے شمع کے پاس آیا، شمع کو میز پر کچھ لکھتے ہوئے دیکھ کر تنویر مسکراتے ہوئے زیدی سے کہنے لگا۔ "آپ نے پڑھے ہیں شمع کے افسانے؟ دیکھئے حقیقت نگار ادیب ایسے ہی ہوتے ہیں۔" شمع کو ایسے لگا جیسے اس کے سارے افسانے تنویر کی ٹانگوں سے لپٹے ہوئے زیدی اور خود اُس کا منہ چڑا رہے ہیں، وہ تڑپ کر بولی۔ "حقیقت نگار کوئی بھی نہیں ہوتا سبھی جھوٹ لکھتے ہیں! جھوٹے — اپنے آپ کو صرف تھوڑی دیر کے لئے فریب دینے کو —

اور میں نے تو کب سے افسانہ لکھنا چھوڑ دیا ہے ـــــ!

"چھوڑ دیا" تنویر کا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا اور جب تنویر یہاں سے چلا گیا تو زیدی نے آہستہ سے پوچھا "آپ نے افسانہ لکھنا کیوں چھوڑ دیا ـــ؟"

"اس لئے کہ کہاں تک اپنے کو فریب دیتی"۔ وہ کانپ رہی تھی ایک طرح بے حس، خاموش اور ساکت تصویر دیکھتے دیکھتے اس کی آنکھیں بیزار ہو چکی تھیں۔ وہ چڑچڑی ہو رہی تھی۔ اس کی رگوں کا خون جیسے اُبل رہا تھا۔ آج وہ زیدی سے سب کچھ کہہ دینا چاہ رہی تھی، وہ ایک پاگل کی طرح زیدی کو تکتی ہوئی بے بسی سے بولی "میرے افسانے نقلی تھے۔ میں نے سراب کو دریا بنا کر اس سے اپنی پیاس بجھانا چاہی تھی"۔ اس کی آواز تھرا رہی تھی۔ "میں بتاؤں کہ حقیقت نگاری کسے کہتے ہیں۔ لیجئے یہ میری ڈائری! شاید اسے پڑھ کر آپ سمجھ سکیں گے" اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے چند قطرے ٹپک پڑے اور ڈائری اس کی کانپتی ہوئی انگلیوں کے درمیان لرز رہی تھی۔ ـــــ! شمع اپنی پُرنم نگاہوں سے زیدی کو ڈائری پڑھتا ہوا دیکھ رہی تھی۔

زیدی کا چہرہ تمتمایا ہوا تھا اور پسینے اس وقت بھی اس کی پیشانی پر چمک رہے تھے۔ زیدی نے ڈائری کو پڑھ کر میز پر رکھ دیا اور اس کی گہری خاموش نگاہوں کو محسوس کیا۔ وہ تھک کر جیسے نڈھال ہو رہی تھی۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا اس کو میز، زیدی ڈائری اور کمرے کی ساری چیزیں گھومتی ہوئی لگ

رہی تھیں۔ اس کے پیر کانپنے لگے۔ شمع نے یکایک گرتے ہوئے کسی چیز کا سہارا لینا چاہا کہ اچانک اسے اپنے کندھے پر موٹی موٹی انگلیوں والا تنومند کا بھدا سا ہاتھ محسوس ہوا۔ اس نے چونک کر پیچھے دیکھا مگر وہاں کوئی نہ تھا۔ کمرے کی گہری خاموشیوں سے اُکتا کر اس کا جی چیخ چیخ کر رونا چاہ رہا تھا۔ وہ جلد سے جلد اس جگہ سے بھاگ جانا چاہتی تھی۔ زیدی کی تکتی ہوئی بے بس آنکھیں اور اس کے کانپتے ہوئے خاموش ساکت لبوں کو نفرت سے دیکھتی ہوئی کمرے سے جاتے ہوئے وہ چڑ کر آہستہ سے بولی —

"بزدل" ــــ!

# نئے طریقے

جب تک لڑکیوں کا مدرسہ گنجان بستی کے اندر ایک بہت بڑے پھاٹک والے مکان کے اونچے مگر شکستہ حال اسارے پر رہا وہ بڑے اطمینان کا زمانہ تھا۔ پھٹے پرانے بورے پر چھوٹی بڑی بہت سی لڑکیاں قطار باندھے دیواروں سے پیٹھ لگائے خوب ہل ہل کر گلا پھاڑ پھاڑ کر اپنا سبق یاد کرتیں۔

دو وقت کی پڑھائی، گھر گلزار رہتا۔ کام بھی کتنے نکل جاتے۔ کوئی مسالہ پیس دیتا، کسی لڑکی سے پانی بھروا لیا، کوئی جھاڑو دے دیتی۔ اور

اس کے بدلہ میں دوپہر کو تختی کی لکھائی معاف کردی جاتی پھر کون نہ لکھنے سے جی چراتا۔ جیم کے دائرے اور شین کے شوشوں کے لئے کتنی ماریں پڑتی تھیں۔

صبح کو تازہ دم مولوی صاحب بڑی قرأت سے قرآن شریف پڑھاتے اور بیچاری لڑکیاں تھپڑ کھا کھا کر آنسو پونچھتی ہوئی بدبداتیں " اللہ کرے ہاتھ مڑے پلو پڑے ، اے کے میرا کان جھنجھنا دیا" شام کو بڑا اچھا لگتا ۔ گرمیوں میں لڑکیاں صحن میں ٹاٹ پر بیٹھی تختی پر کتابوں کو رکھے جب سارے سبق کو یاد کر لیتیں تو پھر ایک ساتھ چلا چلا کر بڑے مزے میں کہتیں " پورب سے پچھم گیا آفتاب اجازت ملے تو اٹھاؤں کتاب" اور بیچارے مولوی جی چھٹی دے دیتے ۔ مہینے گزرتے سال ختم ہوتا نہ تو کوئی پاس ہوتا اور نہ فیل۔ آٹھ دس روز پر کسی نہ کسی لڑکی کی "شروع کرائی" ہوتی تو جماعت کی ساری لڑکیوں کو شکر کے لڈو ملتے اور کبھی گڑ کا تلکٹ ، اور یہ کسی کا احسان نہ ہوتا سب کے ساتھ یہی ہوتا تھا۔ جہاں کوئی نئی کتاب آئی یا نیا سیپارہ شروع کیا بس دو چار آنے کی مٹھائی آتی اور چار آٹھ آنے مولوی صاحب کو اور لڑکیاں بڑی خوشی سے مولوی ذکی صاحب کے سامنے سمٹی سمٹی شرماتی ہوئی ، اوروں کو کنکھیوں سے دیکھتیں ۔ ہل ہل کے نئی کتاب کھولے ، مولوی صاحب کے ساتھ آہستہ آہستہ کہتی جاتیں "ربِّ یَسِّر وَلا

توالسّہ وتمتمہ بالخیر۔ کتابیں شروع ہو ہو کر ختم ہوتی رہیں مگر لڑکیاں کبھی اس کا مطلب نہ سمجھ سکیں کہ انہوں نے جو بار بار پڑھا اس کے معنی کیا تھے

ہاں، تو اسی طرح مولوی صاحب کو ہر جگہ سے کچھ نہ کچھ ملتا تھا کہیں سے چاول آجاتے تھے کہیں سے آٹا اور کسی کے یہاں سے گڑ۔ کسی نے ایک روپیہ، آٹھ آنہ مہینہ بھی باندھ دیا تھا اور کہیں سے روزانہ ترکاری ہی آجاتی تھی، ایک تھیں حکیم صاحب کی بیٹی انہوں نے کبھی کچھ نہ دیا۔ بس ہمیشہ مولوی صاحب کے گھر کا قارورہ دکھا کر باپ کے یہاں سے دوا لا دیا کرتیں بچارے مولوی ذکی کا خاندان بھی کافی بڑا تھا روز ہی کوئی نہ کوئی بیمار رہتا، بیوی اور چھوٹے بچے ہمیشہ کے روگی اور مولوی صاحب کو بھی بڑھاپے میں ہزاروں قسم کی نت نئی شکایتیں لگی رہتیں۔ بچارے اس گاؤں کے اونچے گھرانے سے تھے اور ان کا لڑکپن بڑے آرام سے گذرا تھا جوانی میں فکریں پڑیں مگر بڑی لاپروائی سے گذار دی گئیں، جب بیوی کے مرنے پر دوسری شادی کی اور بچوں کا خرچ کافی بڑھ گیا، تو چھکے مگر ساری چیزیں نکل چکی تھیں اُن کے باپ کے بسائے ہوئے کئی گھر آباد تھے، اونچے اور نیچے دونوں ہی گھرانے، یہ بچارے سب سے پہلی بیاہتا بیوی کی اولاد تھے۔ ترکہ میں چیزیں تین گھرانوں میں بٹ گئیں، چوتھے گھر کو کسی نے نہ پوچھا، مولوی صاحب کو رہنے کے لئے باہر کا بنگلہ ملا تھا اونچا

اسارہ ایک بڑا کمرہ ایک کوٹھڑی اور بس، اسی میں سارے بچے، چھوٹے بڑے سب ہی زندگی گذار رہے تھے، مولوی ذکی بچارے سبق پڑھاتے ہوئے کبھی کبھی لڑکیوں سے اپنے گھر کی باتیں بڑی ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے بتاتے تھے۔

بس اسی طرح مکتب چلتا رہا کتنی لڑکیاں پڑھ پڑھ کر اپنے گھروں میں بیٹھ گئی تھیں اور ان کی جگہ ہر روز نئی نئی لڑکیاں آتی رہیں۔ مولوی صاحب کبھی سارا سارا دن اطمینان سے گھومتے رہتے۔ ان کی لڑکیوں نے سبق دے دیا اور جاؤ چھٹی۔ مولوی صاحب کی خوشامدیں بھی خوب ہوتیں۔ کسی کے گھر ذرا سا بگاڑ ہوا۔ تو اُسے محسوس ہوتا جیسے اب اس کی لڑکیاں رہیں سب کی سب جاہل۔ کس کی مجال تھی جو انہیں کچھ کہدے اور مولوی صاحب اکثر یہی کہتے کہ وہ بچیوں کو تعلیم کے ساتھ خانہ داری بھی تو سکھا رہے ہیں۔

اتنے بڑے گاؤں میں لڑکیوں کے پڑھنے کا کوئی معقول انتظام نہ تھا۔ گاؤں کے بلند خیال لوگوں نے اس خیال سے بھی توجہ کی کہ شائد ایک غریب خاندان اس صورت سے جی سکے اور مولوی ذکی کے مکتب کو ضلع کے بورڈ نے منظور کر لیا۔ مولوی صاحب کے خاندان کے ساتھ لڑکیوں کو بھی خوشی تھی انہیں چھوٹے چھوٹے ڈسک ملے تھے اور دیواروں

پر کلاسوں کی چٹیں لگ گئی تھیں اور انہیں یہ بتا دیا گیا تھا کہ پہلے کلاس کے بعد جب وہ دیوار سے لگی ہوئی دوسری چٹ کے نیچے بیٹھیں گی تو وہ پہلے سے ایک کلاس اور اونچی ہو جائیں گی۔ پہلے پہل لڑکیاں بڑی باضابطگی سے حاضری بولتی رہیں مگر جب انہوں نے دیکھا کہ بڑی سی بڑی ضرورت سے مجبور ہو کر نہ آنے سے بھی فائن لگتا ہے تو انہیں یہ باتیں اکھرنے لگیں۔ مولوی صاحب کہتے "پہلے سے درخواست کیوں نہ دی" اور لڑکیاں دل ہی میں کہتیں "جی ہاں۔ ایک ہی دیوار تلے تو رہتے ہیں کیا معلوم نہ تھا"

بارہ روپیہ مہینہ کے ساتھ بستی سے کچھ پرے دریا کے کنارے ایک خوبصورت سا مدرسہ بھی بن گیا تھا، مولوی ذکی کے دن اب کچھ آرام سے بیت رہے تھے کتنی لڑکیاں ان کے دم سے پڑھی لکھی ہو گئی تھیں، وہ کسی کو نہ بھولے تھے سب ہی کو پوچھتے "کون کہاں ہے"؟ کس کس کی شادی ہوئی؟ "کتنے بچے ہیں؟" اور ان کو اپنے مکتب کی پہلی لڑکیوں کو دیکھ کر بڑی مسرت ہوتی وہ سمجھتے، جیسے یہ پودے یہ پھول انہی کی وجہ سے تو لہک رہے ہیں، اور اب ان کی اپنی لڑکیاں بھی تو سیانی ہو چکی تھیں ایک ساتھ تین اتنی لمبی چوڑی دھاگڑ جیسی لڑکیاں، ہردم ان کی آنکھوں میں کھٹکتی رہتیں۔ لیکن جب وہ اپنے تینوں بیٹوں کو دیکھتے تو یکدم سے ان کی نظر اپنے بڑے لڑکے کے بے طرح بڑھتے ہوئے ہاتھ پاؤں پر پھسلتی

وہ خوش ہوتے "اب یہ کمائے گا!" اور پھر ان کی نگاہیں اپنے دونوں چھوٹے چھوٹے بیٹوں پر جاتیں تو ان کا جی چاہتا کہ وہ انہیں کسی طرح جلدی سے کھینچ کر اتنا بڑا کر دیں کہ پھر وہ اپنے بیٹوں کی کمائی اطمینان سے بیٹھ کر کھا سکیں۔ وہ ایک طرح پندرہ برس سے پڑھاتے پڑھاتے تھک گئے تھے، بڑھاپے کی کمزور اور چڑچڑی آنکھیں ایک ہی طرح کی کتابیں پڑھاتے ہوئے بیزار سی ہو گئی تھیں۔ کئی کتابیں تو ایسی تھیں جو انہیں پوری پوری زبانی یاد ہو گئی تھیں۔

زندگی میں سب سے کٹھن دن ان کے لئے وہی تھا جب پہلے پہل مدرسہ کے ملاحظہ کے لئے انسپکٹرس آ رہی تھیں۔ دیہات کی لڑکیاں، گھر کے دھندے اور چھوٹے بھائی بہنوں کی ساری ذمہ داریاں۔ جب تک مدرسہ بستی میں رہا کچھ نہ تھا، ضرورت پڑی آواز دے کر پکار لیا یا آدمی بھیج کر گھڑی دو گھڑی بھر کے لئے بلا بھیجا۔ ایک دو کام کر کے ننھے کو بغل میں دبائے آ پہنچیں، دم بھر کسی دوسرے کو بچہ تھما کر سبق لینے چلے گئے پھر ساتھ بٹھا کر پڑھنا شروع کر دیا۔ مگر اب دیہات کی گلیوں میں چلتے چلتے سرگوشیاں ہونے لگ گئی تھیں۔ سیانی سیانی لڑکیاں بھلا اتنا دور جائیں گی پڑھنے؟ رفتہ رفتہ مدرسہ کی سیٹیں خالی ہونے لگیں۔ کسی کی ماں بیمار تھی، کہیں مہمان آئے ہوئے تھے، اور کسی کے کام پڑے تھے۔ انسپکٹرس کے آنے کے روز بچارے مولوی

ذکی گھر گھر سے لڑکیوں کو جاکر اپنے ساتھ لائے، ایک دو سبق اپنے اطمینان کے لئے بھی سُن لئے۔ لڑکیاں کافی بھول چکی تھیں مولوی صاحب کی لڑکیوں نے بڑی محنت سے انہیں کچھ یاد کرایا، ہر جگہ کی صفائی کرائی گئی، کرسیاں میز سب جھاڑ پونچھ کر صاف کر دیئے گئے۔ اور رجسٹر میں جگہ جگہ سے حاضری بنا دی گئی۔ شہر سے موٹر میں انسپکٹرس آئی، لڑکے دوڑ پڑے "ہوا گاڑی ہوا گاڑی" اور یہاں موٹر کے انجن کی طرح مولوی صاحب کا دل دھڑ دھڑ کر رہا تھا۔ رجسٹر کچھ دیکھے اور کچھ پٹکے گئے اور جب لڑکیوں کو امتحان کے لئے پڑھنے کو کہا گیا تو ساری لڑکیاں لیڈی انسپکٹرس کو ٹکٹک تکتی رہیں کتابیں سب کے سامنے کھلی ہوئی پڑی تھیں لیکن معصوم اور متحیر نگاہیں اپنے سے ایک عجیب اُجلی اور لال شکل پر جمی ہوئی تھیں۔ لکھنے کو جب کہا گیا تو قلم جیسے ہاتھوں میں جم کر رہ گئے، کنارے بیٹھی ہوئی لڑکیاں ایک دوسری کے کانوں میں جھک جھک کر چپکے سے کہہ رہی تھیں "ارے میم ہے رے میم! پہلے کبھی دیکھا بھی تھا کہیں؟" بچارے ذکی ایک مجرم کی طرح خاموش کھڑے تھے، پندرہ برس میں سے آج کتنی مصیبتوں کا یہ دن تھا، ان کے لئے۔ انسپکٹرس لڑکیوں سے مایوس ہو کر بولی "مفت کے روپے پاتے ہو تم، ساری لڑکیاں تو بستی کی پکڑ کر لائی گئی ہیں"۔ کئی دنوں تک چرچا ہا مدرسہ ٹوٹ رہا ہے اور بچارے ذکی کانپ جاتے،

کھانے کا یہی تو ایک سہارا ہے پھر کیا ہوگا۔؟" مگر کبھی کبھی گھبرا کر ان کا دل بھی چاہتا کہ ٹوٹ بھی جائے یہ مدرسہ۔ آخر پہلے کیا تھا؟" مگر جب اتنے بچے تو نہ تھے اور پھر وہ چپ ہو جاتے۔

مدرسہ ٹوٹا نہیں لیکن ٹوٹنے کی دھمکی بڈھے ذکی کی زندگی کو اجیرن کئے ہوئے تھی۔ ہر برس دو برس پر انسپکٹرس کی ڈانٹ اور رجسٹر کے پٹکے جانے کے وہ عادی ہو گئے تھے۔ گاؤں کے باثر لوگوں نے بچارے ذکی کا مدرسہ ٹوٹنے سے بچا دیا تھا؟ اور انسپکٹرس کو بھی ان کی حالت کا کچھ احساس تھا مگر سب سے زیادہ بچارے ذکی کو یہ باتیں بڑی اذیت پہنچا رہی تھیں کہ مدرسہ کی سیٹیں روز بروز خالی ہوتی جا رہی تھیں۔ آخر اسی گاؤں کی اتنی لڑکیوں کو انہی نے پڑھا لکھا کر آدمی بنایا تھا۔ پھر اب انہیں ستانے کے لئے یہ گھڑی گھڑی رپورٹ کیوں ہونے لگی تھی کہ پڑھائی ٹھیک سے نہیں ہوتی۔ وہ ان باتوں سے پہلے ڈر رہے تھے۔ اور یہ انہی کا جی جانتا تھا کہ کمر کے درد سے بھی پریشان رہ کر کتنی مشکلوں سے لاٹھی کے سہارے مدرسہ جاتے رہے، پھر پڑھانے میں بھی کبھی کوتاہی نہ کی۔ ان کی آنکھوں کے آگے دھند چھانے لگی تھی مگر تب بھی دونوں وقت اپنی کسی لڑکی کے سہارے رُک رُک کر پڑھاتے ہی رہے۔ لیکن بچارے مخالفتوں کے آگے کچھ زیادہ دنوں تک ٹھہر نہ سکے۔ آخر انہیں ہٹنا ہی پڑا ضلع کے بورڈ کا یہی حکم تھا۔

اور اب مولوی فرکی کی جگہ ان کی بڑی لڑکی پڑھانے لگی، پہلے پہل لڑکیاں تالی بجا کر خوب ہنسیں "اُستانی جی اُستانی" لیکن رفتہ رفتہ رہی سہی لڑکیاں بھی اسٹرائک کر گئیں، وہ چار تھیں جنہیں مشکلوں سے سمجھا کر روکا گیا تھا جوان لڑکی اس پر کنواری، بستی سے باہر مدرسہ میں جا کر کیسے اکیلی پڑھاتی، بچاری دل جس کا بچپن پڑھنے لکھنے کی اُلجھنوں سے دور، بڑا معصوم گذرا تھا۔ اپنے بیمار روتے بلبلاتے بچوں کو چھوڑ کر ہمیشہ اس کے ساتھ سایہ کی طرح لگی رہتی اسے خیال تھا۔ "غریبوں کی دُنیا بڑی خراب اور بے حد تنگ ہے ابھی کیا کچھ ہو، کون جانے"۔ ماں بیٹی کا دن کبھی کبھی ایسا بھی گذر جاتا کہ سنسان مدرسہ کی خالی بنچوں پر پڑی رہتیں۔

بس ایسے ہی مہینے اور سال ختم ہوتے گئے، اور وقت کے ساتھ ساتھ منی آرڈر کا انتظار بھی طول کھینچتا چلا گیا۔ یہ تو ہمیشہ ہی سے تھا کہ روپے کے آسرے میں ایک دو مہینے دیر ہو گئی، بستی کے بنیوں سے اُدھار لے لیتے، آخر گاؤں کے بنئے تھے بک جھک کر ہی دیتے تھے بستی میں روپے آنے، اور نہ آنے کی کسے خبر نہیں رہتی مگر اب تو جیسے حد ہو گئی تھی، تنخواہ پہلے سے آدھی ہو کر بھی چھ، اور آٹھ آٹھ مہینے تک روپے نہ ملتے تھے۔ ضلع کے بورڈ کا انتظام بگڑ چکا تھا۔ جب غریبوں کے حمایتی دیس کے ٹھیکہ داروں کے بھوکے بچوں کے پیٹ بھر چکے تو پھر وہ دوسروں کی بھوک اور نحیف چیخوں کو بھول گئے تھے۔ ادھار۔ قرض اور فاقہ۔ یہ تو روز ہی کی باتیں تھیں کپڑوں

میں پہلے سے کئی گنے زیادہ پیوند لگنے تھے، چولھا کبھی جلتا اور کبھی نہیں بچے بھی سمجھ گئے تھے دنیا میں بس یہی تو ہوتا ہے بھوک لگے مگر کھانا نہ ملے"۔

بڈھے فکی کے بیکاری کے دن کسی طرح گذر رہے تھے۔ وقتوں پر نمازیں پڑھتے اور اس کے بعد جھلنگی پلنگ پر چت لیٹے ہوئے تسبیح کے دانوں کو گھماتے اور کبھی اپنے ہاتھوں کی انگلیوں کو ایک دوسرے سے ملاتے اور بجلاتے رہتے تھے۔ انہیں اس کا یقین تھا کہ اب آرام کے دن آ رہے ہیں۔ وہ لیٹے لیٹے سوچتے رہتے اپنے لڑکے کی کمائی سے پہلے ان لڑکیوں کو بیاہ دیں گے اس کے بعد گھر بنتا رہے گا۔" یوں ہی وہ سارا سارا دن ہوائی قلعے بناتے رہتے۔ مگر ان کی اُمید ان کی زندگی کی روشنی کا آخری سہارا، جیسے یکایک وہ ٹھونس گئے جوان بیٹے کی پانی سے پھولی ہوئی لاش دیکھ کر وہ مہینوں گھر سے باہر نہ نکلے۔ اور جب مہینوں بعد اپنے منجھلے لڑکے کی چھوٹی چھوٹی اُنگلیاں اور سوکھے ہوئے ہاتھوں کے سہارے باہر آنے جانے لگے۔ تو پھر انہیں موہوم سی آس بندھی "مرنا جینا تو ہوتا ہی رہتا ہے"! وہ اب پھر زور زور سے بدبدا کر تیز تیز تسبیح کے دانوں کو کھٹ کھٹانے لگے۔ انہیں سلیم بہت عزیز ہو گیا تھا۔ وہ اس کی تھوڑی تھوڑی سی باتوں کا خیال رکھتے اُنہوں نے سوچا تھا "اتنے دنوں سے سلیم کالی پینٹ کے لئے دق کر رہا ہے اس وقت روپیہ ملنے پر منگا دیں گے۔ مگر بخار میں سر کو دھنتا ہوا" کالی پینٹ

کالی پینٹ" کرتا ہوا سلیم ہمیشہ کے لئے چپ ہوگیا۔ آندھی جھکڑ اور طوفان میں چند کھوکھلی جڑیں قائم نہ رہ سکیں۔ ان کی راتیں اور دن ویسے ہی رہے، مگر اب آنکھوں میں گذری ہوئی چند تصویریں، لبوں پر نالے اور کچھ آنسو بھی تھے اور دلوں میں پُرخوف شکوے۔

بڑھاپے۔ غم۔ آنسو اور روز کے فاقوں نے بچارے ذکی کی آنکھوں کو بیکار کر دیا تھا۔ سال بھر میں ایک دو بار دو تین مہینے کی تنخواہیں باقی رکھ کر کچھ روپے مل جاتے تھے۔ مگر کتنے تیز اڑنے والے ہوتے تھے وہ روپے بھی، اِدھر آئے اُدھر غائب، قرض ادھار۔ سود۔ سب ہی تھا نا؟ اور اس پر یہ جنگ کی گرانی۔ روپے کے تین سیر چاول! کیا ہو سکتا تھا، خیر اتنا تو ضرور ہوتا کہ کچھ دنوں تک ادھار لینے میں پریشانی نہ ہوتی تھی۔

آخر کئی مہینے پیسہ پیسہ کاٹ کر بڑی مشکلوں سے مولوی ذکی نے اتنا جمع کر لیا تھا کہ وہ شہر جا کر خیراتی ہسپتال میں اپنی آنکھیں بنوا سکیں۔ گھر کی مصیبتیں تو روز کی تھیں اور اب اس بورڈ کا بھی کیا آسرا تھا۔ جانے کب یکدم روپیہ دینا بند کر دے پھر بورڈ کو کیا پڑی تھی؟ وہ بچارے کہاں سے اتنا روپیہ لاتے کہ اس کے حکم سے اپنی لڑکی کو مڈل تک پڑھاتے۔ کنواری لڑکی روپیہ اور مڈل کی سرٹیفکیٹ، جب وہ سوچتے تو ان کا سر گھوم جاتا۔ اور اب شاید آنکھیں بنوا کر وہ پہلے کی طرح گھر بیٹھے کچھ کر سکتے تھے۔

ان کا ننھا بیٹا جب ان کی سفید داڑھی سے کھیلتا ہوا زور سے ہنستا تو ذکی کو محسوس ہوتا جیسے وہ ان کے خواب ہائے رنگیں پر ہنس رہا ہو اور جب ان نگاہوں کے سامنے کبھی کبھی پہاڑ جیسی تینوں لڑکیاں گھومتیں تو ان کا جی چاہتا کہ ان کے ساتھ وہ اپنا سر بھی دیوار سے ٹکرا لیں۔ پھر ان سے زیادہ انہیں دُنیا پر غصہ آتا۔ بڑی تہذیب یافتہ بنی ہے دنیا، اٹوں کے میل، چاول چھانٹنے کے کل، سنگر مشین، ہر چیز کی کلیں، ہر طرح کی مشینیں منٹوں میں کام ختم۔ مگر تم غریب اپنا سر پھوڑ لو۔ مر جاؤ۔"

لمحے، گھنٹے، دن اور مہینے جونک کی طرح آہستہ آہستہ رینگ رہے تھے۔ آنکھیں سردیوں میں بنتی ہیں اور اب جاڑا ختم ہو رہا تھا۔ ہر روز روپے کا انتظار تھا اور گرانی میں کوئی قرض بھی نہیں دیتا۔۔۔ گھر رہ کر قرض اور بڑھتا جا رہا تھا آخر مولوی ذکی اپنی بیوی اور چھوٹے لڑکے کو ساتھ لے کر جانے لگے۔ اُن کے پاس آنے اور جانے کے کرائیوں کے لئے روپے تھے انہیں موٹر، ریل اور کشتوں میں اتنے مشکلوں سے جمع کئے ہوئے روپے دینے کے خیال سے بڑا افسوس ہونے لگتا، لیکن پھر ان ہی پیسوں سے ان کا مستقبل بھی تو روشن نظر آتا تھا۔

ان کی بیوی جاتے وقت مسلسل آنسو بہا رہی تھیں اور جب مولوی ذکی اپنے بڑے سے پھاٹک کے سامنے موٹر پر سوار ہونے لگے تو انہوں نے گھوم

کر پیچھے اپنی تینوں مغموم لڑکیوں کو دیکھا انہیں ایسا لگا جیسے وہ خود غربت اور یاس کے جبڑوں سے نکل کر بھاگتے جا رہے ہیں۔ اور بند ہوتے ہوئے شکستہ حال پھاٹک کے زنگ آلودہ قلابوں کی زوردار کڑکڑاہٹیں سُن کر بڈھے ذکی نے موٹر پر بیٹھے بیٹھے یہ محسوس کیا کہ بھوک اور فاقوں کے نوکیلے خوفناک دانت ان کی تینوں پہاڑ جیسی بٹیوں کو چبا رہے ہیں کڑکڑ کڑ ــــ! مگر اپنے دل کی تسکین کی خاطر انہوں نے چلتی ہوئی موٹر سے جھک کر پکارتے ہوئے کہا "بس آج کل میں روپے آجائیں گے ہاتھ دبا کر خرچ کرنا" ــــ

مدرسے کے گھنٹے ختم ہو جاتے پھر خاموش دن اور تاریک راتیں پہلے سے زیادہ بھیانک طور پر گذرنے لگتیں کبھی ایک آدھ وقت کچھ کھا کر اور کبھی مسلسل فاقے، ماں نے ان کے لئے جتنا سنجوگ کر رکھا تھا وہ سارا ختم ہو چکا تھا، بستی کے اندر ایک ہی آنگن میں کئی کھڑکیاں کھولتے ہوئے بھی لوگ جانتے تھے کہ تین بے زبان لڑکیاں بے تھاہ پڑی ہیں "اگر روز کون دے سکتا تھا؟" کئی کئی دن ایسے بھی گذر جاتے کہ تینوں بہنیں بھوک سے نڈھال ہو کر بیٹھی بیٹھی، لحاف میں ایک ہی ساتھ گھس کر سو رہتیں مگر پھر صبح کی کرنیں ان کی آنتوں میں تیز تیز نشتر چبھونے لگتیں۔ پانی کے چند گھونٹ اور آنگن کے کچے پکے بیر، انہیں کچھ دیر کے لئے تسکین دے دیتے تھے۔

بھوک میں شرافت کو نباہنا بھی کتنا کٹھن ہے کسی کو کھاتے ہوئے دیکھو

اور ہٹ جاؤ مانگنے پر، ڈانٹ ڈپٹ کر کچھ تو مل جاتا ہے۔ مگر شرافت میں نہ مانگنے پر سوکھا ہوا نحیف چہرہ دیکھتے ہوئے بھی کوئی نہیں پوچھتا۔ دن گذرتے ہی رہے اور روپیہ کا شدید انتظار ختم نہ ہوا، بل کبھی کا بھیجا جا چکا تھا۔ آٹھ مہینوں سے انتظار کی جانگسل گھڑیاں دراز ہوتی جا رہی تھیں۔ ڈاکیئے کی آواز سن کر آخر ایک روز تینوں بہنیں بے تحاشا پھاٹک کی طرف دوڑتی ہوئی گئیں۔ مگر اُن کی آنکھوں میں اندھیرے چھانے لگے روپیہ کی جگہ ان کے ہاتھوں میں ایک کارڈ تھا۔ بڈھے ذکی نے لکھا تھا "میرے آنکھوں کی سرخیاں کسی صورت سے نہیں جا رہی ہیں کئی ہفتے ہو گئے دواؤں کا کوئی فائدہ نہیں ہوا اور ان سرخیوں کے رہتے ہوئے۔ ڈاکٹر اپریشن کرنے سے انکار کرتے ہیں۔ ہم ایک دو دنوں میں آ رہے ہیں۔"

دو دنوں سے لگاتار فاقے برداشت سے باہر تھے۔ بڑی بہن سے چھوٹوں کی تکلیف دیکھی نہ گئی۔ اپنے مکان کے نزدیک، قریب قریب ہر گھر سے وہ کچھ نہ کچھ قرض لے چکی تھی مصیبتیں تو روز کی تھیں۔ پھر بھی اس کے قدم انہی گھروں کی طرف بڑھنا چاہ رہے تھے۔ مگر اس نے اپنے پاؤں کی انگلیوں کو زمین میں گاڑ لیا۔ کہاں تک وہ ہر گھڑی بے حیا بنتی۔ اس نا امیدی میں یکایک اپنے موٹی موٹی کھردری انگلیوں میں پھنسی ہوئی انگوٹھی پر اس کی نظر پڑی۔ وہ بے اختیار مسکرا پڑی جیسے ٹیلیگ منی آرڈر سے آئے ہوئے سفید

سفید روپے اور چکنے چکنے نوٹوں سے اُس کے ہاتھ بھر گئے ہوں۔ اس نے انگلیوں اور دانتوں سے بُری طرح کھینچ کر مشکلوں سے انگوٹھی اتار دی۔ بڑی بہن کا چہرہ خوشی سے تمتما رہا تھا۔ چولھے میں آگ جلا کر تینوں بہنیں ایک ساتھ بیٹھ رہیں۔ دو دنوں سے گھر میں رونق سی لگ رہی تھی، شعلے لپک رہے تھے اور مٹی کی ہانڈی میں چاول کے اُبلنے کی پھدپھد آواز سے ان کے دلوں میں خوشی ناچ رہی تھی۔ سب سے چھوٹی بہن دوکان سے آئے ہوئے اخبار کے ردی ٹکڑے کو اُٹھا کر دیکھتی ہوئی بولی۔ "نوری باجی دیکھو تو پانی کے اندر کشتیوں میں آگ کیسے لگ گئی ہے"؟ بڑی بہن نے کاغذ کو زمین پر بچھاتے ہوئے بتایا "یہ کشتیاں نہیں ہیں، سنو جہاز ہیں جہاز بہت بڑے بڑے، سمجھیں؟ اس گھر سے بھی بڑے"۔ سب بہنیں اس پر جھک پڑیں سنتی ہو صدو؟ نوری نے منجھلی بہن کو متوجہ دیکھ کر کہا "ارے یہ جنگ ہو رہی ہے، ایک کا دشمن ایک ہوتا ہے نا۔ بس جہاں اپنے مخالف دشمن کا فوجوں اور سامانوں سے بھرا ہوا جہاز دیکھ لیا اوپر ہوائی جہاز سے آگ لگانے والے گولے برسانے لگتے ہیں" "تب۔! نوری باجی پھر کیا ہو جاتا ہے؟" "پھر! جہاں کہیں نشانے پر گولے لگے بس آگ لگ جاتی ہے دیکھو ایسے ہی یہ بیچارہ جہاز جل رہا ہے"۔ وہ غور سے ردی اخبار کے ٹکڑے کو دیکھنے لگ گئیں۔ "تو باجی! سب جل جاتا ہے سب؟" "ہاں شنو، سارے

لوگ اور لاکھوں روپے کی چیزیں، یہی جنگ کی چیزیں بندوق توپ آدمیوں کی فوج اور بورے بورے غلّوں سے لدے ہوئے جہاز۔" شنو اُبلتے ہوئے بھات کو للچاتی نظروں سے دیکھتی اپنے سوکھے لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولی "کیا کیا ہوتا ہوگا۔ بوروں میں ایں ثوری باجی'؟ چاول آٹا سب ہی کچھ؟۔ یہی ایک چیز رہتی ہے پگلی! انڈے، گھی، مکھن، گوشت، مچھلی سب ہی چیزیں۔" اس وقت شنو کو اسلحوں اور اپنے ہی جیسے انسانوں کے جلتے ہوئے جہازوں کی پروا نہ تھی۔ مرنے کی تکلیف سے کہیں زیادہ زندگی میں بھوک کی شدّت سے انتڑیاں اس کے پیٹ میں اینٹھی جا رہی تھیں۔ "تو یہ کھانے کی چیزیں جلا کیوں دیتے ہیں باجی؟" "ہاں تو جیسے دے دیں تمہیں کھانے کو۔" "تو کھانے کی چیزیں جلا کر انہیں کیا ملتا ہوگا۔ اور وہ جو ان بچارے اتنے آدمیوں کو جان سے مار دیتے ہیں" "مگر وہ آدمی بھی تو دوسروں کو مارتے ہیں۔ لیکن یہ غلّے بچارے۔ یہ کیا کرتے ہیں ان کا، ثوری باجی کتنا دن چلتا یہ غلّہ سب گھر بھر جاتا اس سے؟ کبھی بھی نہ گھٹتا، مگر اب سب جل رہا ہے بچارا۔" شنو کی آنکھیں پُرنم ہوگئیں۔

"یہ جنگ ہے شنو جنگ" ثوری نے بجھتے ہوئے چولھے کو کاغذ کے ٹکڑے سے سُلگاتے ہوئے کہا، کاغذ بھک سے جل کر بجھ گیا، چولھے کے سُرخ شعلوں کے آگے تینوں بہنیں سر جھکائے کچھ سوچ رہی تھیں۔

# لوکٹ

اُس نے اپنے کمزور ہاتھوں سے لیٹے لیٹے اپنے گلے کا لوکٹ اوپر کیا تو چوڑیاں جھنجھنا کر اُس کی کہنیوں تک پہنچ گئیں وہ تکیوں کے سہارے خاموش، لوکٹ کو دیکھتی ہوئی سوچنے لگی "جب یہ پہلے دن میرے گلے میں پڑا تھا۔ تو بچارا کیا جانتا ہوگا۔ کہ ہم کبھی ان ہڈیوں پر بھی اس طرح ڈھلکتے رہیں گے؟"

اُس کے سفید لبوں پر ایک ہلکا سا تبسم آیا۔ اور وہ سوچنے لگی۔ "کسی بڈھے پیر کے تعویذ کی طرح یہ لاکٹ کبھی میرے دل کے پاس سے

جُدا نہیں ہوا" پھر وہ لوکٹ کو تکتی ہوئی ہنس دی۔ جیسے کسی کو چڑا رہی ہو "تم بھی تو ایک پہنچے ہوئے مُلّا ہی ہو؟"

اُس کے خیالات پرواز کرنے لگے۔ آج سے دو سال قبل جب اُسے ٹائیفائڈ ہوا تھا۔ تو وہ مسلسل پانچ روز تک بیہوش رہی تھی۔ اور جب اُسے ہوش آیا تو وہ اپنا برہنہ بازو ڈاکٹر زیدی کے ہاتھوں میں دیکھکر شرما سی گئی تھی۔ اچانک اُس نے اپنے بائیں طرف ایسے دیکھا جیسے اس وقت بھی ڈاکٹر زیدی وہاں سرنج لئے بیٹھا ہو۔ ہار کا مہین چین اُس کی اُنگلی میں اُلجھا ہوا تھا۔ اور لوکٹ ایک بیمار دل کی طرح آہستہ آہستہ ہل رہا تھا۔ وہ اپنی بند آنکھوں پر ہاتھ رکھے سوچ رہی تھی —— دوسرے دن ڈاکٹر زیدی اُسے کتنی دیر تک سمجھاتا رہا تھا۔ آخر اُسے تھا کیا؟ اُس کے تو بیسیوں مریض پڑے کراہتے رہتے تھے۔ اور ایک دن جب وہ اپنے مریضوں کا چارٹ دیکھتے دیکھتے تھک کر میری کرسی پر بیٹھا اخبار دیکھ رہا تھا تو میں نے اُسے کتنی بار پکارا تھا اور آخر تنگ آکر وہ اس کے کندھے کو ہلا کر بولی "یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے ڈاکٹر؟ تم کھوئے کھوئے سے کیوں رہتے ہو؟ وہ ہنس کر بولا" چونکہ ان دنوں آپ کے جلوے بڑے بیتاب ہیں اسی لئے بیہوش سا رہتا ہوں!"

جانے کیوں، —— ڈاکٹر کی یہ باتیں سُنکر میں نے بڑی تکلیف

محسوس کی تھی۔ اُس نے آہستہ سے اپنی آنکھیں کھولیں کمرے میں پہلے کی طرح خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ وُہ اپنی آنکھوں کو بند کر کے پھر سوچنے لگی —— "اور ایک بار —— جبکہ میری طبیعت زیادہ خراب ہو گئی تھی تو زیدی بے چارہ ساری رات جاگتا رہا تھا۔ میرے قریب ہی وُہ دریچہ پر بیٹھا ہوا چاند کو دیکھ رہا تھا۔ اور میں اپنی جلتی ہوئی بیمار آنکھوں سے اُسے تک رہی تھی اور —— پھر اُس کے بعد وُہ جو اپنے کاموں سے گھبرا گھبرا کر میرے پاس بھاگ آتا تھا —— کام بھی تو بے حد تھے۔ سبھی ڈاکٹر بھاگتے ہوں گے۔ لیکن مجھے بھی اُس کا کتنا انتظار رہتا تھا۔ جب وُہ میرے پاس سے چلا جاتا۔ تو میں اپنے گرد و پیش کیسی بھیانک تاریکی سی محسوس کرنے لگتی تھی اور پھر ہسپتال کی دم توڑتی ہوئی سسکیاں —— میرا گلا کیسا گھٹنے لگتا تھا۔ فقط اُس کی مسکراہٹیں تھیں۔ جن سے میرا کیبن روشن ہو جاتا تھا۔

اور ایک دن جب وُہ مجھے دلچسپ لطیفے سُنا رہا تھا میں کتنا ہنس رہی تھی —— جانے کہاں سے مجھے دیکھنے کے شوق میں آپا آ کر بیچ میں بول اٹھیں۔ یہ اپنی مریضہ کو اسی طرح ہنساتے ہوئے جلد اچھا کر دیجیے۔ تا کہ انہیں دلہن بنایا جائے۔

"ابھی، ان کی شادی؟" —— زیدی بوکھلا کر بولا —— "عقد پہلے

جو ہو چکا ہے۔ وہ لوگ تو کب سے شور مچا رہے ہیں"

آپا کی یہ باتیں سُنکر مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے میری بہت بڑی کمزوری کا اعلان زیدی کے سامنے کر دیا گیا ہو —— اس دن سے پہلے، میں ان باتوں سے کتنا خوش ہوا کرتی تھی مگر اُس دن ........

اُس دن تو مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے پگھلتا ہوا گرم گرم سیسہ کسی نے میری رُوح پر ڈال دیا ہو —— میں اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر خاموش ہو گئی تھی۔ زیدی نے آہستہ سے پوچھا۔ "سو رہی ہیں آپ"؟ "نہیں تو" میں نے اپنی آنکھیں کھولتے ہوئے کہا۔

پھر اُس کے بعد وہی خدمت، وہی خلوص، اور وہی ہمدردی مجھے کتنا جلدی اچھا کر رہی تھی —— ڈاکٹر پال نے مجھے چلنے کو کہدیا تھا سب سے پہلی بار مجھے نرس لیلی نے چلایا تھا زیدی مجھے بار بار سہارا دے رہا تھا۔ میں خاموش تھی۔ میرے پیر کانپ رہے تھے نرس لیلی کے کندھے پر ہاتھ رکھے میں آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ میرا دماغ ڈاکٹر کے سینٹ کی تیز خُشبو سے معطر ہو رہا تھا۔ میرے دل میں ایک نغمہ گونج رہا تھا۔ اور میری رُوح

اس خوشبو سے لہک کر ایک پُر سرور رقص کر رہی تھی۔"

"اور پھر —— ایک دن" وہ اسی طرح اپنی آنکھوں کو بند کئے ہنس دی۔ وہ جمعہ میں نے زیدی کے ہاتھ پر بلاڈونا کی گرم گرم پٹی چپکا دی تھی تو وہ کتنا اُچھلا تھا آہ! کتنے حسین دن اور کتنی پیاری راتیں تھیں وہ!

"الماس تم نے ابھی تک دوا نہیں پی؟"

"نہیں ٹھہر کر پلانا بڑی اچھی نیند آ رہی ہے۔"

"اور ڈاکٹر صاحب جو آ رہے ہیں انجکشن دینے؟"

"اُونہہ ڈاکٹر صاحب" اُس نے چڑھ کر نفرت سے کہا۔

"جیسے بہترین علاج تو کر رہے ہیں کہ، بس چت لیٹی رہو۔ ایک دم چت، ذرا نہ ہلنا، یہی کہنا تو اُنہیں آتا ہے۔ وہ اپنے دل میں چڑچڑا کر بولی۔" آہ ڈاکٹر زیدی" —— اور وہ پھر اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر سوچ میں غرق ہو گئی۔

ایک دن جب کافی رات گئے وہ چپکے سے پاؤں دبا دبا کر اپنے کمرے کی طرف جا رہا تھا۔ تو اُسے نہ جانے کیا خیال آیا۔ خاموشی سے میرے پاس آ کر کہنے لگا۔" اچھا جاگ رہی ہیں آپ؟ میں سمجھا، سو چکی ہوں گی۔ اور یہ کھانا؟ کیا آپ نے صبح سے سچ مچ برت رکھنے کا

ارادہ کر لیا ہے ؟" وہ ایک طرف بھرا ہوا طشت دیکھ کر بولا۔ میں اپنی مریض کو اس کی اجازت نہیں دے سکتا، سمجھیں ؟

اچھا تو یہ نارنگی کا شربت ہی پی لیجئے نا! وہ بہ مشکل نارنگیوں کو نچوڑتے ہوئے بولا اس کے بعد وہ اپنے جوتے کی آواز چھپاتا آہستہ آہستہ چل کر پگھلتی ہوئی برف کو مشکلوں سے تھامے، جب بوکھلایا ہوا اپنا رومال ڈھونڈنے لگا تو میں بے اختیار ہنس پڑی۔

پھر اس کے بعد ـــــ وہ جیسے اپنے آپ کو یاد کراتے ہوئے سوچنے لگی۔" وہ جو میرے قریب ایک مریضہ کی حالت خراب ہو گئی تھی۔ اس کے عزیز گھبرا گھبرا کر میرے کیبن میں آکر زیدی کو ڈھونڈھ رہے تھے۔ آخر میں اٹھی۔ چپکے سے قریب ہی زیدی کے کمرے میں گئی۔ وہ اپنے بستر پر خاموش لیٹا ہوا لمپ کی روشنی سے کھیل رہا تھا ـــــ
" کیسے ڈاکٹر ہو تم ؟" ـــــ میں کچھ دیر کے بعد بول اٹھی۔

" کون ـــــ تم، الماس ؟" ـــــ وہ گھبرا کر بولا۔

" تمہاری ایک مریضہ دم توڑ رہی ہے۔ اور تم کتنے اچھے ڈاکٹر ہو۔ جو یہاں بجلی کی شعاؤں سے روشنی اور اندھیرے کا کھیل کھیل رہے ہو" ـــــ میں نے اسے چھیڑتے ہوئے بے تکلف لہجے میں کہا تھا!

"میں بچاری کے لئے اب کچھ نہیں کر سکتا" الماس اور کسی کو مرتے ہوئے بھی تو نہیں دیکھا جاتا۔ وہ پتھرائی ہوئی مایوس آنکھیں آخری بار ایک ڈاکٹر سے اپنی زندگی کی ملتجی ہوں گی۔"

"لیکن تمہیں چلنا ہوگا زیدی! اس کے عزیز تمہارا بے چینی سے انتظار کر رہے ہیں۔"

وہ لوٹا لیکن مریضہ مر چکی تھی۔ میں نے اُسے چھیڑتے ہوئے کہا۔ "تمہیں کون ڈاکٹر کہتا ہے زیدی"؟

"میں بھی تو اب یہی سوچتا ہوں الماس۔ کہ ڈاکٹر کی جگہ میں خود ہی ایک قابلِ رحم مریض ہوں"۔ ۔ ۔ اُس کے بعد میں ساری رات یہی سوچتی رہ گئی تھی۔ کیا ڈاکٹر بھی ایک مریض ہے۔ ایک قابلِ رحم مریض۔

میرے گھر جانے کے دن جیسے جیسے نزدیک آ رہے تھے۔ زیدی کھویا کھویا سا رہنے لگا۔ ایک دن جب میں بری طرح شام تک سوتی رہی تھی۔ یکایک زیدی کی آواز سے چونک پڑی۔ میں نے اس سے شکایتاً کہا تھا۔ "کتنا اچھا سا خواب دیکھ رہی تھی تم نے جگا دیا"۔ وہ سادگی سے بولا "الماس زندگی کے بعض لمحے بھی تو حسین اور دلفریب خواب کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ اور ہم نیند سے بڑھی ہوئی بیہوشی میں اُسے ہمیشہ دیکھتے ہی رہنا چاہتے ہیں۔ مگر خواب۔

پھر خواب ہی ہے نہ ۔ اور اُس کی تعبیر کتنی تلخ ہوتی ہے ۔"

ڈاکٹر پال کے جانیکے بعد زیدی مجھے کتنی دیر تک سمجھاتا رہا "دل کا خیال رکھنا" یہ بیچارا بیمار ہو گیا ہے دوڑنا مت ۔ زیادہ تر لیٹی رہنا ۔ ٹائیفائڈ نے اپنی ایک یادگار چھوڑ دی ہے ۔ سمجھیں ؟ تمہارا دل اپنا راستہ کھو کر ذرا زیادہ مضطرب ہو گیا ہے ! " آہ ! " ——— الماس نے میز پر رکھی ہوئی زیدی کی تصویر کو دیکھتے ہوئے کہا ۔ میں تمہیں یہ کیسے کہہ دیتی کہ میرا دل اپنی رفتار کیوں بھول گیا ہے ۔" ——— اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے موٹے موٹے قطرے گرنے لگے ۔ کمرے میں پہلے کی طرح ایک گہرا سکوت چھایا تھا ۔ وہ آنکھوں کو بند کر کے پھر سوچنے لگی ۔ چلتے وقت میں نے زیدی سے کہا تھا ۔" مجھے بھولو گے تو نہیں ؟" اُس کے آخری الفاظ میں کتنی مایوسی تھی ۔ وہ آہستہ آہستہ ایسے بول رہا تھا جیسے کسی بہت بڑے طوفان کو بمشکل روک رہا ہو ۔

اُس کے بعد ایک طویل اور خاموش لیکن پُر اضطراب زمانہ ' میری شادی ، اور پھر یہ دل کی بیماری ۔ دعوتی کارڈ زیدی کو بھی گیا تھا ۔ لیکن ٹھیک شادی کے روز اُس کا ایک پارسل ملا ۔ دل کی شکل کا یہ نایاب تحفہ "۔ الماس نے لوکٹ کو اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا ۔" اور لوکٹ پر جڑا ہوا یہ چورچور شیشہ جبھی تو اُسے پہنے رہتی ہوں ۔ ایک

دل شکستہ کو شکستہ دل کے قریب۔ لیکن یہ لوکٹ! میں نے اسے ابھی تک کیوں نہ کھولا تھا وہ اُسے اُلٹ پلٹ کر دیکھتی ہوئی بولی۔ اُس نے دونوں ہاتھوں سے اُسے کھولنے کی کوشش کی۔ مگر ناکامیاب رہی۔ آخر وہ اُسے دانتوں سے آہستہ آہستہ دبا کر کھولنے لگی۔ لیکن پہلے ہی جیسی مایوسی —— اتنی سی محنت پر وہ پسینہ سے تر ہو گئی۔ اُس نے لوکٹ کو ہاتھ میں لے کر پھر سے دیکھا۔ اُس کا دل کہہ رہا تھا۔ شاید اس میں کچھ ہو —— اُس نے آخری بار کوشش کی۔ مگر اُس کے سینے پر لوکٹ کے شکستہ شیشے بیکسانہ طور پر گر پڑے۔ یکایک الماس چونک پڑی " آہ لوکٹ ٹوٹ گیا؟ " اور ٹوٹے ہوئے شیشے منتشر ہو گئے! اُس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ ایک ہلکا سا تبسم اُس کے مرتعش لبوں پر آیا۔ وہ زیدی کی تصویر کو دیکھتے ہوئے بولی!

" زیدی! دیکھ رہے ہو۔ دیوی جب اپنے پجاری کو پوجنے لگتی ہے تو پھر اُس کی حالت کیا ہو جاتی ہے "۔

وہ لوکٹ کا شکستہ شیشہ اپنی مٹھی میں لئے نحیف بازوؤں سے اپنے تڑپتے ہوئے دل کو بھینچ رہی تھی۔ اُس کا سارا بدن کانپ رہا تھا۔ وہ پسینے سے تر ہو رہی تھی۔ اُس نے ذرا زور سے کہا " پانی " اور پھر وہ بے چینی اور اضطراب میں ایک تکیہ کے سہارے کروٹ

لے کر خاموش ہو گئی۔

"الماس" اٹھو! ڈاکٹر صاحب آ گئے۔ اٹھو!"

"الماس"

مگر اُس کے دل کی حرکت بند ہو چکی تھی۔ اور اس کے قریب ہی لوکٹ کے شکستہ شیشے پڑے ہوئے تھے ؛

# اِنتظار

"تیس روز — بس"! — "تیس ہی روز تو" — یاسمین نے ذرا ہنستے ہوئے کہا۔

آفتاب کی شہابی کرنیں ریل کے سبز ڈبوں پر تڑپ رہی تھیں — کھڑکی پر ہاتھ رکھتے ہوئے یاسمین بولی "دیکھتے ہو! — کیسی افسردہ شام ہے! تم جا رہے ہو نا؟ — اسی لئے تو" —

گاڑی کی ایک ہلکی سی جنبش سے اُس کے دل پر زور کا دھکا لگا دل کے دھڑکنے کی تیز آواز اُس کے کانوں میں گونج رہی تھی —

"دھک دھک۔ کھٹ کھٹ" ـــــ اس کے پیر کانپ رہے تھے۔ لیکن وہ اسی طرح کھڑکی پر ہاتھ رکھے آہستہ آہستہ اُس کے ساتھ چلتی رہیں۔ اُس نے اپنے تھرتھراتے لبوں سے بمشکل مسکرانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا ـــ "تیس ۳۰ روز زیدی" ـــــ اور دریچہ پر جھکتے ہوئے زیدی نے ہنسکر کہا "بس تیس ۳۰ ہی روز تو" ـــــ!

یاسمین کے ہاتھوں سے سرکتا ہوا دریچہ آگے نکل گیا۔ دریچے پر جھکا ہوا زیدی اُسے دیکھ رہا تھا مگر وہ اُسے نہ دیکھ سکی۔ آنکھوں کی ایک ہلکی سی چمک گاڑی اور اس کے درمیان حائل ہو چکی تھی ـــــ

وہ زیدی کے سفید رومال کے سوا اور کچھ نہ دیکھ سکی رومال ایک لمحہ کیلئے اسٹیشن کے شیڈ سے چھپ کر پھر نظر آیا۔

یاسمین واپس جاتے ہوئے مڑمڑ کر پیچھے تک رہی تھی اور آخری بار جب وہ پل پر چڑھی تو تیسری سیڑھی پر کھڑی دیر تک پیچھے مڑکر دیکھتی رہی۔ مگر وہ کچھ نہ دیکھ سکی۔ اس کی آنکھوں کے آگے ایک دھواں سا چھارہا تھا۔ اپنی آنکھوں کو ہتھیلیوں سے ملتے ہوئے جب اُس نے دیکھا تو گاڑی تیزی سے جارہی تھی۔

وہ سر جھکائے، آہستہ آہستہ ایسے چل رہی تھی۔ جیسے آج اپنی مسرتوں کی دُنیا اپنے ہاتھوں سے ہمیشہ کیلئے مٹا کر آرہی ہو۔ اس کے

دماغ میں ایک عجیب سنسناہٹ سی ہو رہی تھی۔ ایک افسردگی اس پر چھائی جا رہی تھی اور ایک مبہم سا خوف اس کی روح کو بھینچ رہا تھا ایک ناکام سے تبسم میں وہ اپنے لبوں کی تھرتھراہٹ کو چھپانا چاہ رہی تھی اس کی آنکھیں بے اختیار پھوٹ پھوٹ کر رونا چاہتی تھیں لیکن وہ بڑی مشکلوں سے اپنے آنسوؤں کو روک رہی تھی۔ اس کی آنکھوں کے آگے سیاہ، سُرخ اور نیلے پیلے دھبے آ آ کر تیزی سے رنگ بدل رہے تھے۔ وہ حیران تھی اس سے پہلے بھی کئی بار زیدی کو رخصت کر چکی تھی اور ایک بار جب وہ خود جا رہی تھی تو زیدی کا چہرہ کتنا اترا ہوا تھا اس کے آنسو کتنی مشکلوں سے آنکھوں میں تھمے ہوئے تھے لیکن اُس وقت تو وہ اتنی مضطرب نہ ہوئی تھی —— پھر آج یہ اُسے کیا ہو گیا تھا —؟

پُر رونق بازاروں سے گذرتے ہوئے اسے یُوں محسوس ہو رہا تھا جیسے سارا شہر بھائیں بھائیں کر رہا ہو اور جب اس کی نظر ہوسٹل کی چار دیواری پر پڑی تو ضبط نہ کر سکی۔ کتنی افسردگی چھا رہی تھی اُس پر، اُسے سارا ہوسٹل ایک ٹھنڈی لاش کی طرح سرد نظر آ رہا تھا۔ جس کی رُوح اب اس سے بہت دُور جا چکی تھی۔

وہ اپنے کمرے میں آ کر خاموشی سے لیٹ رہی اُس کی سسکتی ہوئی رُوح پر آج اس کی سانس کا ہلکا سا زیروبم ایک ناقابل برداشت بوجھ

بن رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کے آگے اب بھی زیدی کا سفید رومال بار بار چھپ چھپ کر اُبھرتا اور پھر اُبھر اُبھر کر چھپ جاتا ـــــ بالکل اُسی طرح اُس کا دل بھی زور زور سے دھڑک کر ٹھہر جاتا اور ٹھہر ٹھہر کر دھڑکنے لگتا ـــــ وُہ یہ بھول جانا چاہتی تھی کہ زیدی اس سے دُور جا چکا ہے۔ اُس نے میز پر رکھی ہوئی تصویر کو دیکھتے ہوئے سوچا۔ یہ "تیس ۳۰ روز کیسے کٹیں گے زیدی"! ہنستی ہوئی تصویر اور زور زور سے ہنستی ہوئی نظر آئی ـــــ کیسی طنزیہ ہنسی تھی وُہ! اور آنکھوں کی شریر مُسکراہٹ اُسے کتنی مایوس نظر آرہی تھی ـــــ اُس نے اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے تصویر رکھ دی۔ کمرے کی تنہائیوں میں اُسے ایسا لگ رہا تھا۔ جیسے زیدی کی تصویر زور زور سے قہقہے لگاتی ہوئی اُس سے دُور، بہت دُور ہوتی جارہی ہے۔ جہاں سے اب اس کی ہنسی کی ایک ہلکی سی آواز آنا بھی بند ہوگئی، وُہ اس کمرے سے بھاگ جانا چاہتی تھی اس کا دم گھٹ رہا تھا اس کی سانس تیزی سے چل رہی تھی۔ مگر وُہ بھاگ نہ سکی، پھر اس کی آنکھوں کے آگے زیدی کا وہی سفید رومال اُبھر اور چھپ رہا تھا! ـــــ "آخر آج یہ بار بار اسے زیدی کا سفید رومال ہی کیوں یاد آرہا ہے اس نے ایک ہی خیال ایک ہی یاد اور ایک ہی تصور سے گھبرا کر البم دیکھنا شروع کیا۔ سنہرے گوشوں میں لگی ہوئی رنگین تصویریں، طرح طرح کے مناظر، جھیلیں، تالاب، جنگل، پہاڑوں کے

درختوں میں بل کھاتی ہوئی ریل کی چمکیلی پٹڑیاں۔ اور پھر —— پھر وہی یاد وہی تصور اور وہی دریچے پر زیدی کا جھکا ہوا سر۔ اور اس کے بعد دل کی تیز آواز دھک دھک کھٹ کھٹ "

وہ اپنی آنکھوں کو ملتی ہوئی اپنے خیالات کو بدلنے کی انتہائی کوشش کرنے لگی۔ جب وہ کالج کی چھٹیوں میں اپنی عزیز دوست پروین کے یہاں گئی تھی تو کتنی رات گئے تک وہ دونوں باتیں کرتی رہی تھیں اور دوسرے دن جب وہ مسلسل باتیں کرتی جا رہی تھیں تو سامنے دیکھ کر وہ چونک اُٹھی تھی اور پھر اپنے پیچھے جھومتے ہوئے ساری کے آنچل میں سمٹ کر خاموش ہو گئی تھی۔ پروین ہنستے ہوئے جب تعارف کرا چکی تو اُس نے سب کی نظروں سے چھُپ کر اُسے ایک بار پھر دیکھا۔ اس کی آنکھیں سیاہ، مدھ ماتی اور گھنیری پلکوں میں اُلجھ کر رہ گئیں۔ وہ اُسے کتنی دیر تک دیکھتی رہی یہ اُسے خود بھی معلوم نہ تھا۔

اُس دن وہ ہر بار پیچھے مڑ مڑ کر دیکھتی رہی۔ باتیں کرتے کرتے وہ ایسے چونک اٹھتی جیسے کوئی آ رہا ہو وہ ہنستے ہنستے ایسے شرما جاتی جیسے کسی کی نگاہیں بہت دیر سے اُسے گھور رہی ہوں۔ مگر وہاں کوئی نہ تھا ——

اُس کی آنکھیں کسی کو ڈھونڈ رہی تھیں اور وہ ایسا محسوس کر رہی

تھی کہ اُسے کسی کا انتظار ہے۔

پروین اور جاوید اُسے اپنے ساتھ لئے لئے گھر کی ساری چیزیں دکھا رہے تھے "یہ گھر کی لائبریری ہے" "یہ میرا آفس، اور یہ میرے سونے کا کمرہ ہے"۔ پردہ اُٹھا کر دوسرے کمرہ میں جاتے ہوئے پروین ہنسکر بولی اور "یہ بھی تو دیکھو یاسمین!! اپنے جاوید کا ایک عجیب سا بن مانس" یاسمین ٹھٹک گئی وہ بے خبر ایک معصوم بچے کی طرح سو رہا تھا۔ اس کی مخمور آنکھیں بند ہونے پر بھی کھلی ہوئی تھیں اور اُس کا کھلتا ہوا رنگ ایسا لگ رہا تھا۔ جیسے شام کے ہلکے دھندلکے میں کسی نے ایک تیز روشنی جلا رکھی ہو —!

وہ جاوید کے قہقہوں سے چونک پڑا۔ اس کی خمار آگیں نگاہیں ایک لمحے کیلئے یاسمین کے چہرے پر رکیں اور پھر وہ جاوید کی مسلسل ہنسی سے گھبرا کر بول اُٹھا "احمق کہیں کے تمہیں یہاں بلایا کس نے تھا؟ یہ بلا پوچھے آپ جو میرے کمرے میں گھس آئے"۔ "جی ہاں۔ آپ دن بھر اُلّوؤں کی طرح چھپتے پھریں اور ہم جو خبر نہ لیں تو پھر کہئے گا جاوید نے اپنے گھر بلا کر دوست کی اچھی خاطر کی تھی"۔ اس وقت یاسمین کو دھکا سا لگا "کیا وہ پھر چلا جائے گا؟" ——

پروین کی لگاتار باتیں اور جاوید کے پرشور قہقہوں کے درمیان بیدی خاموش بیٹھا رہتا اور ایک کنارے اپنے آنچل میں سمٹی ہوئی یاسمین یہ دیکھتی

رہتی کہ "زیدی کی خاموشی بھی کتنی دلچسپ ہے" ـــــ!

ایک بار اس کی نگاہیں زیدی کی نظروں سے ٹکرا گئیں۔ یک بیک دو نگاہوں کے تصادم سے اُس کی رُوح میں زور کی جھنکار پیدا ہوئی اور اسے ایسا محسوس ہوا جیسے ان خاموش پلکوں کی ہر جنبش اس کے سازِ دل کے خوابیدہ تاروں کو یکبارگی چھیڑ گئی۔ وُہ جانتی تھی کہ زیدی کی نگاہیں خاموش نہ تھیں اور اب وُہ پروین اور جاوید کی صحبتوں میں زیادہ سے زیادہ دلچسپی لینے لگا تھا اُس کا کمرہ خالی پڑا رہتا اور بس ایک ہی طرح چپ چاپ کتنی کتنی دیر تک بیٹھا رہتا اور اُسے خبر نہ رہتی" ـــــ!

ایک نامعلوم سی کشش اُسے زیدی کی طرف کھینچ رہی تھی لیکن اسے یہ بھی معلوم تھا کہ وُہ خود بھی تو ایک مقناطیس تھی" ـــــ!

یکایک اس کی نگاہوں میں لرزتی ہوئی زرد کرنیں ناچنے لگیں اور ہوا میں لہراتا ہوا وہی سفید رُومال ـــــ وُہ چونک اُٹھی اس کی آنکھوں کا طلسم ٹوٹ چکا تھا۔ اور وُہ اپنی آنکھوں کو بہلا نہ سکی ہوا کی تیز سنسناہٹ اُسے ایسی معلوم ہو رہی تھی جیسے ڈوبتی ہوئی شعاعوں میں سبز گاڑی تیزی سے بھی جا رہی ہے۔ دُور بہت دُور ـــــ شاید اُفق کے اُس پار ـــــ! سیاہ بل کھاتی ہوئی پٹڑی اس کی آنکھوں کے آگے چمکنے لگی اور گذری ہوئی باتیں اُسے پھر سے یاد آنے لگیں۔

"وہ زیدی کی آنکھوں کا اضطراب دیکھ چکی تھی اور ان خاموش نگاہوں کا تعاقب کرنا جانتی تھی۔ لیکن وہ زیدی کی خاموشی سے تنگ آ چکی تھی۔ اُس کا دل چاہتا کہ وہ زیدی سے دُنیا جہان کی ساری باتیں کر ڈالے کبھی ہنستے ہوئے کبھی شرماتے ہوئے اور کبھی آنچل میں سمٹتے ہوئے۔

یاسمین، آخر زیدی کی خاموشیوں سے اُکتا گئی۔ وہ اُس سے کھنچی کھنچی سی رہنے لگی۔ اُس نے سوچا شاید وہ اس طرح اُس کا سکوت توڑ سکے!

مگر یاسمین اب ہار چکی تھی اُسے یقین ہو رہا تھا کہ وہ ایک شدید غلط فہمی میں مبتلا تھی —— "لیکن خود اس کی تڑپتی ہوئی رُوح —— ؟ وہ اسے کیا کرے گی ؟ ؟" کاش وہ یہاں نہ آتی !" "آخر وہ اُسے کاہے یاد کرے گی ؟ —— وہ اپنے کمرے کی تنہائیوں میں دیر دیر تک سوچتی رہتی۔ —— " اور وہ اس کی آنکھوں کا تعاقب ! اُنہیں کیسے بھلا سکے گی ؟۔ وہ جھنجھلا اُٹھتی۔ "کیوں کسی کی باتیں اس طرح یاد رکھے گی"۔ مگر جب مبہم خیالی اور تھوڑی سی باتیں اس کی حساس طبیعت پر کافی اثر انداز ہوتی رہی تھیں تو پھر یہ اس کی روح کا انقلاب —— ! کیا اب اُسے کبھی سکون نہ ملے گا —— ؟ -" اور زیدی کی وہ خاموش نگاہیں اسے چپکے سے کیا کہہ دیتی ہیں ؟" —— مگر کون جانے —— ہو سکتا ہے کہ وہ بس کسی شعلے کے بھڑکنے کی ایک تماشائی ہوں ؟" وہ اپنے دل سے

سارے خیالات کو بھلا دینے کی انتہائی کوشش کر رہی تھی۔ لیکن شاید بھلا دینے والی باتیں زیادہ یاد آتی ہیں۔ وہ یہ سوچ کر کانپ اٹھی۔ اور اس روز زیدی نے بڑی مشکلوں سے جھجکتے ہوئے مجھ سے کہا تھا" وہاں آپ کے گھر سے نزدیک ہی تو میرا کالج ہے"۔ "تو کیا آپ اس کی سسکتی ہوئی روح، مضطرب مگر خاموش آنکھوں کے تعاقب میں ہمیشہ تڑپتی ہی رہے گی؟"۔۔۔

وہ جلد سے جلد یہاں سے بھاگ جانا چاہتی تھی اس کی حساس روح زیدی کی گہری خاموشی اور رسمی تکلفات کے بارے دبی جا رہی تھی۔ وہ کھوئی کھوئی وحشت زدہ سی رہنے لگی، پروین یاسمین کی خاموشی سے پریشان تھی وہ اکثر اس افسردہ فضا سے اکتائی ہوئی چیخ اٹھتی "اللہ ۔۔۔ یاسمین تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ یہ ہمیشہ تم ایک خیالی دنیا میں کیسے زندگی گذار سکو گی"۔۔۔

پروین اور جاوید بڑی مشکلوں سے اپنے مہمانوں کو سنیما لے گئے آخری سین کو دیکھ کر یاسمین ضبط نہ کر سکی۔ فلم میں آنسوؤں سے ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں دیکھتے ہی وہ رو پڑی تھی۔ اُسے محسوس ہو رہا تھا کہ اپنی اس پُر اضطراب زندگی کا پریشان کن مستقبل دیکھ رہی ہو۔ وہ پہلے سے زیادہ غمگین واپس آئی ۔۔۔ لوگ اپنی اپنی پسند کا اظہار کر رہے تھے۔

وہ زیدی کی باتیں سُنکر چونکی "محبّت دل کی گہرائیوں میں صرف چھپنے ہی کیلئے ہوتی ہے"۔۔۔؟؟ یکایک اس کی نگاہیں زیدی کی نظروں سے ملیں، اس کے دل میں ایک شدید بیتابانہ تڑپ ہوئی بد کاش وہ زیدی کی ان آنکھوں میں صرف اپنے لئے کبھی چمکتے ہوئے آنسو دیکھ سکے"

وہ متعارف ہو چکے تھے، پروین کے یہاں سے واپس آکر بھی زیدی اور یاسمین ایک دوسرے سے ملتے رہے۔

اکثر تنہائیوں میں یاسمین خیال کرتی جیسے زیدی اس سے بڑی بیتابی سے مِل رہا ہے، مگر جب وہ اس کے متبسّم، مگر پُرسکون چہرے کو دیکھتی تو اُسے یقین ہو جاتا کہ اُس کا وہ خیال یُونہی سا تھا۔ وہ جب بھی ملتے کتنی کتنی دیر ساری دُنیا کی باتیں کرتے رہتے، اِدھر اُدھر کی باتیں عجیب عجیب سے قصّے، گھنٹوں وہ ایسے ہی بولتے رہتے لیکن ان باتوں کے درمیان وہ کبھی کبھی تڑپ سی جاتی آخر اُسے ان باتوں سے کون سا لگاؤ تھا۔ اس کی تمنائیں تو خود ہی سِسک سِسک کر دم توڑ رہی تھیں۔

وہ اپنے کالج سے آتے ہی ۔۔۔ بیتابانہ طور سے، باہر احاطے اور اور سامنے سڑک پر تکتی ہوئی زیدی کی منتظر رہتی اور جب وہ اُسے دیکھتی تو پھر یہ بھول جاتی کہ ابھی ابھی کسی کا شدید انتظار اس کے لئے سوہانِ رُوح بن رہا تھا۔

وُہ ہر روز تنہائیوں میں زیدی سے کہنے کو بہت سی باتیں سوچتی، اُسے حیرت ہوتی کہ اکیلے میں تکیوں کے سہارے اُس کی آنکھیں زیدی کی سرد مہریوں کو یاد کر کے کیوں پھوٹ پڑتی ہیں۔ مگر زیدی کی پُرسکون نگاہوں سے ملتے ہی اس کی رُوح کا اضطراب اور تڑپتے ہوئے آنسو نہ جانے کہاں چلے جاتے ہیں"۔۔۔

یاسمین اپنے دریچے سے لگی ہوئی دیر تک زیدی کو جاتے ہوئے دیکھتی رہتی اور جب وُہ اُس کی نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا تو اس کا دل آہستہ سے کہتا "کاش تم میری رُوح کی پکار کو سُن سکتے"۔ پھر وُہ خود ہی ہنس دیتی "تم جانتے ہوئے بھی انجان بنے ہوئے ہو زیدی ۔۔۔!"

ایک روز دریچہ سے جھانکتے ہوئے زیدی نے پہلی بار بے تکلفی سے کہا تھا "تم کہاں چھپتی پھر رہی ہو یاسمین!۔ میں تمہیں اتنی دیر سے ڈھونڈ رہا تھا۔۔۔ کتنی باتیں کہنی ہیں تم سے ۔۔۔ دیکھو، اتنی ساری باتیں" وُہ مسکراتا ہوا اپنے دونوں ہاتھ پھیلا کر بولا ۔۔۔ یاسمین زور سے ہنس پڑی اُس نے دل میں آہستہ سے کہا "آج تمہاری خاموشی ٹوٹی نا آخر ۔۔۔!؟"

مگر جب وُہ آئی تو زیدی گھر کے بہت سے لوگوں میں گھرا ہوا اُن سے باتیں کر رہا تھا۔ اُس دن سے وُہ ہر روز یہی سوچتی "کیسی باتیں ہونگی؟

——"اتنی ساری باتیں" —— "کیا کیا ہوں گی؟" —— "وہ اِن باتوں کا جواب کیسے دے گی؟" "کیا کیا کہے گی اُس سے؟" مگر کچھ دنوں کے بعد جب یاسمین نے اُسے پھر سے دیکھا تو وہ بالکل پہلے جیسا تھا، وہی مطمئن، سنجیدہ چہرہ اور وہی "ایک طرح کی خاموش شریر مسکراہٹ" —— اُس نے اپنی نگاہوں کو جھکایا" شاید یہ روشن، دھلی ہوئی آنکھیں رات کی تنہائیوں میں اشکبار رہتی ہوں گی۔ اس کی نیاز مندیاں اب صورتِ ناز بننے کی آرزومند تھیں وہ پجاری بن کر اب دیوی بننے کی تمنّا رکھتی تھی، وہ چاہتی تھی کہ جب اُس کی محبت تڑپتی ہوئی بجلی بن کر زیدی کی رُوح میں چمکی تو اُسے بادل کی طرح گرجنا چاہیئے تھا —— مگر زیدی خاموش تھا پہلے کی ہی طرح خاموش، اس کی نگاہیں کہہ رہی تھیں کہ اُسے سازِ محبت مل چکا ہے، نغمے اس کے دل میں گھُٹ رہے ہیں۔ مگر اس کی اُنگلیاں کانپ رہی تھیں اور وہ بربطِ دل کے ان تاروں کو چھیڑنا نہیں جانتا تھا —— !

جذبات کے تیز اور شدید دھارے میں بہتی ہوئی وہ کبھی کبھی پاگلوں جیسی لگتی وہ اکثر تنہائیوں میں سب کی نظروں سے چھُپ کر، اس کرسی سے بیتابانہ لپٹ جاتی جس پر ابھی ابھی زیدی بیٹھا تھا۔ وہ زور زور سے سانس لیتی ہوئی سینٹ کی ان مخصوص خوشبوؤں کو اپنی رُوح میں جذب

کر لینا چاہتی تھی جو زیدی کے جانے کے بعد بھی کمرے میں بسی رہ جاتی ——— جلے ہوئے سگرٹ کے چھوٹے ٹکڑے ایش ٹرے سے اُٹھا لیتی کہ یہ چند لمحے زیدی سے قریب ترین رہ کر اُس کے لبوں سے ہمکنار رہے ہیں اسے یہ ٹکڑے بیحد عزیز لگتے وہ سگرٹ کے اِن جلے ہوئے ٹکڑوں کو اپنے لبوں سے لگاتی ہوئی زور سے کش لیتی زیدی کے متبسم لب اور اس کے درمیان سفید سفید سگرٹ اس کی نگاہوں میں گھوم جاتے ۔ اسی سگرٹ کا جلا ہوا ٹکڑا یاسمین کے لبوں میں کانپ رہا تھا۔ وہ کسی خیال کے آتے ہی شرما سی جاتی ۔ اُس نے سگرٹ کے اِن جلے ہوئے ٹکڑوں کو اپنے پاس رکھ لیا تھا ۔ اور زیدی کے پسینے اور اس کی پہچانی ہوئی بو سے بسا ہوا ایک رومال بھی اس کے پاس تھا۔ جس کو زیدی بھول کر چھوڑ گیا تھا ——— یہی وہ چیزیں دُنیا میں اُس کی اپنی تھیں صرف اُس کی۔ اسے کوئی چھین نہیں سکتا تھا۔ زیدی اس کا اپنا نہ تھا۔ لیکن زیدی کی یہ چیزیں تو اُس کی اپنی تھیں "———

سڑک پر ایک موٹر تیزی سے گذری ، وہ اپنے فریبِ تخیّل سے چونک اُٹھی اس کی نگاہوں میں پھر زیدی کا وہی سفید رومال لہرا رہا تھا ۔ اسی خیال کو بھلانے کی وہ کتنی کوشش کرتی رہی تھی ——— ابھی ابھی کتنے رنگین لمحے اس کی آنکھوں کے آگے ناچ رہے تھے ۔ آخر آج اُسے یہ کیا ہو گیا

ہے ـــــ اس کے کانوں میں زیدی کی آواز گونجی "بس تیس ہی روز تو" ـــــ اور کمرے کی تنہائیوں میں اُسے محسوس ہوا جیسے بہت سے قہقہے ایک ہی ساتھ گونج اُٹھے۔

زیدی کے جانے سے ایک روز پہلے یاسمین کے لئے یادگار دن تھا۔ وہ اکثر سوچتی "زیدی نے اُس روز کتنی گھُل مِل کے باتیں کی تھیں" ـــــ شام کی چائے بناتے ہوئے اُس نے زیدی کی ایک چوری بھی پکڑی تھی، جب وہ سب سے چھُپ کر یاسمین کی تصویر البم میں سے نکال رہا تھا، وہ جاتے ہوئے بڑی بے تکلفی سے کہہ رہا تھا " بھئی نہ کہو وہ بہت دُور لگتے ہیں بس یہی تیس دنوں کی تو بات ہے" ـــــ سارے لوگ ہنس پڑے تھے۔ وہ اس گھر کا ایک فرد بن کر سبھوں میں عزیز ہو چکا تھا ـــــ مگر یاسمین حیران تھی "زیدی کی وہ سنجیدگیاں کہاں چلی گئی تھیں؟ اُس نے سوچا " یکایک بند ٹوٹ جانے پر سیلاب آ ہی جاتے ہیں" ـــــ

اُس کی نگاہیں کلنڈر کے اوراق پر جمی رہتیں، اُسے یوں لگتا جیسے دن اور راتیں بہت بڑی ہو گئی ہیں، اور جب اُس کی نظر پچیس ۲۵ تاریخ پر گئی تو وہ مسرت سے جھوم سی گئی۔ "آخر اتنے روز ختم ہو گئے نا!؟" وہ اپنی اس دلی کیفیت پر خود ہی ہنس دیتی، پھر

اُسے لوگوں کی کہی ہوئی باتیں یاد آئیں ” اتنی جذباتی اتنی حساس لڑکی کیسے زندہ رہ سکے گی “ ؟

وُہ خط پڑھتے پڑھتے کانپ گئی ” زیدی وائنا بھیجا جارہا ہے “؟ ـــــ وائنا ؟ ” کون جانے اس کا بھائی کب تک اچھا ہو “ ـــــ ؟ میرے اللہ ! ـــــ وائنا ! ـــــ کتنا دُور یہاں سے کتنا دور ـــــ ہندوستان سے باہر ۔ سمندروں کے اس پار “ ـــــ اسے چکر سا آنے لگا ۔ وُہ جانے سے پہلے اس سے مل سکتی تھی ، اس کو دیکھ سکتی تھی ـــــ آخری بار سفید رومال کو ہوا میں لہرا کر چلے جانے والے زیدی کو وُہ ایک بار پھر سے دیکھ سکتی تھی ، ـــــ مگر ، یہ دُنیا ـــــ ؟ وُہ اس سے آگے کچھ نہ سوچ سکتی تھی ـــــ دہکتے ہوئے شعلے اُس کی آنکھوں سے نکلنے لگے اور ، اس کی رُوح بے بس طور پر تڑپ رہی تھی ـــــ

اُس نے اپنے کمرے کے کلنڈر کو نوچ کر پھینک دیا تھا ۔ اُسے ان اوراق سے دحشت سی ہونے لگی تھی ۔ تیس ۳۰ روز ـــــ تیس ۳۰ روز ۔ اُسے آنے والے دنوں کا شدید انتظار تھا ـــــ اس کی نگاہیں مضطرب تھیں اور روح بے چینی سے منتظر تھی ـــــ گرمی کی اتنی لمبی چھٹیاں جیسے اس کا گلا گھونٹ رہی تھیں ۔ وہ کئی

کئی گھنٹے بند کمرے میں چپ چاپ لیٹی ہوئی سوچتی رہتی۔ گذرے ہوئے دن اُس کی آنکھوں میں مچلتے رہتے۔ گذشتہ سال انہی دنوں وہ کہاں تھی —؟ زیدی کو اُس نے پہلی بار کیسے دیکھا تھا — آج کے دن وہ جاوید، پروین اور زیدی سے کیا کیا باتیں کرتی رہی تھی "— دُنیا اس کی نگاہوں میں بس ایک سال کے اندر سمٹ کر رہ گئی تھی۔ جہاں زیدی تھا وہ تھی — پروین تھی، جاوید تھا — پھر وہ تھی اور زیدی"! مگر اب —؟ اب وہ اکیلی تھی۔ کوئی بھی اُس کے ساتھ نہ تھا۔ جب اُس کا دل گھبرا جاتا تو وہ دیر تک زیدی کی تصویر کو اس طرح سے دیکھتی جیسے وہ سچ مچ اس کے پاس ہی ہے۔ اس کی تسکین کے سامان سگریٹ کے چند جلے ہوئے ٹکڑے ایک رومال اور زیدی کی چند تصویریں تھیں — وہ دیر دیر تک ان چیزوں کو دیکھتی رہتی۔ گذرے ہوئے لمحے اُس کی نگاہوں میں گھومتے رہتے، لوگ سمجھتے یاسمین اپنے امتحان کی تیاریوں میں لگی رہتی ہے۔ مگر اُس نے بھولے سے بھی کتابوں کو نہ چھُوا تھا۔

کتنے دن تیس ۳۰ اور اکتیس ۳۱ کے ہندسے بن بن کر خشک پتوں کی طرح کلنڈر سے جھڑ رہے تھے۔ مگر یاسمین بے خبر تھی۔ وہ

ان سوکھتی ہوئی شاخوں کو پہلے ہی نوچ کر پھینک چکی تھی۔ اور دوسری طرف اس کی نگاہیں سہمی اور ڈری ہوئی رہتیں۔ وہ دُور ہی سے کیلنڈر کو دیکھ کر کانپ جاتی۔

طویل خاموشی اور مضطرب آنکھوں کا مایوس انتظار ——— وہ شمع کی طرح پگھلتی جا رہی تھی۔ مگر وہ خود ایک پروانہ تھی اور پروانے شاید اندھیرے میں زیادہ تڑپتے ہیں۔

یاسمین کا وزن تیزی سے گھٹتا جا رہا تھا، اُسے ہر وقت حرارت رہنے لگی تھی، بیزار بیزار، وحشت زدہ، اُکتائی ہوئی بعض دفعہ وہ عجیب عجیب حرکتیں کرتی، چلتے چلتے ٹھہر ٹھہر کر، دیر تک درختوں کے جھنڈ اور جھاڑیوں کو تکنے لگتی۔ بار بار پیچھے مڑ کر وہ ایسے دیکھتی جیسے کوئی آ رہا ہو ——— وہ پہلے کی طرح ہر روز دریچے کو اپنے ہاتھوں سے تھامے، دیر دیر تک سائیکلوں کے چکّر لگاتے ہوئے پہیوں کو دیکھتی ہوئی یہ محسوس کرتی کہ زیدی اس سے ملنے کے لئے آ رہا ہے اور وہ بے چینی سے اُس کی منتظر ہے۔ وہ باتیں کرتے کرتے یکایک چونک پڑتی جیسے کسی کی پہچانی ہوئی آہٹ اُسے سُنائی دے رہی ہو ——— پڑھتے پڑھتے وہ یک بیک بے تابانہ کھڑکیوں سے اپنے احاطے کے بند پھاٹک کو کھول دیتی۔ مگر

پھر جیسے وہ جاگ پڑتی۔ اُس وقت اپنی جذباتی کیفیتوں کا اسے شدید احساس ہوتا۔ دُور تک لمبی سڑک پر کتنے ہی لوگ آتے جاتے رہتے تھے انہیں تکتے ہوئے —— اُس کی آنکھیں پُر نم ہو جاتیں اور وہ، دُور —— خلا میں دیکھتی رہتی، دیکھتی رہتی۔

# شہنا

"بالکل، ایمان سے، بالکل ہندو!" پردے سے لپٹی ہوئی شہنا نے کھلکھلا کر کہا۔ میں نے جھانک کر دیکھا۔ یہ شیطان پھر کہاں سے آ پہنچی؟...

"دیکھیے، بھابی! اِسے منع کیجیے۔ یہ بار بار مجھے ہندو کا ہے کو کہتی ہے؟"

"آپا" وہ اسی طرح کھی کھی کرتی ہوئی بولی۔ "میں جھوٹ کہتی ہوں۔ دیکھو تو ان کا منہ ہندو جیسا ہے نا۔ اوہ! یہ! یہ" اس نے پیچھے سے میرے بالوں کی ایک پتلی سی لٹ، دکھاتے ہوئے کہا۔ "تو یہ کیا ہے؟" "آخر بتاؤ تم ہی یہ کہاں سے آگیا؟"

"کہاں سے آیا؟" میں نے اِسے گھورتے ہوئے کہا "تیرے سر سے اور کہاں سے؟"

"بھٹا کی طرح بھورا بھورا مہین سا!" اور یہ گرہ؟ - کہیں بالوں میں بھی ایسے ہوتے ہیں؟ شہنا ہنستی ہوئی بھاگی - اور میں دیر تک بالوں کی گرہ میں الجھا رہا - اس روز میں نے عہد کر لیا تھا - اب وہاں نہ جاؤں گا - آخر وہ مجھے ہندو کا ہے کو کہتی ہے - میں اپنے کمرے میں آکر خاموشی سے لیٹ گیا - گرہ کھولنے سے ابھی تک انگلیاں دُکھ رہی تھیں - اور بالوں کو بُری طرح کھینچنے سے سر میں درد سا ہو رہا تھا - میں نے آئینہ اُٹھا کر دیکھا - میرا منہ کہاں ہندو جیسا ہے اور پھر کیا ہندوؤں کے مُنہ دوسری طرح کے ہوتے ہیں؟ - مگر پرسوں! گپتا بھی تو مجھے کہہ رہا تھا "تم بالکل بنگالی دکھائی دیتے ہو..." میرا دماغ چکرا رہا تھا - آج شہنا نے مجھے کیسا ذلیل کیا - اپنے بالوں کی لٹ کاٹ کر وہ میرے سر میں باندھنے والی کون؟ اس کا منہ کیسا ہے! —— پہلے دیکھا بھی ہے کبھی؟ پیلا پیلا سا جیسے "انیمیا" ہو گیا ہو، اور وہ شرارت سے بھری ہوئی سپیدسی آنکھیں، توبہ! توبہ! اگر میں ایسا ہوتا - تو کبھی مُنہ نہ دکھاتا -

اس روز مجھے شہنا پر بڑا غصہ آ رہا تھا - میں نے اس کے یہاں جانا بند کر دیا - لیکن دو روز کے بعد ہی میرا جی گھبرانے لگا - آخر یہ بیکاری کے دن کیسے کٹیں گے؟ میرا ٹیبل حساب کی کتابوں سے بھرا پڑا تھا میں نے سوچا -

اچھی کتابیں کہاں سے لاؤں۔؟ آنکھوں کے آگے شہنا کی کتابوں کی الماری گھوم گئی۔ جس میں افسانوں کے بہت اچھے اچھے مجموعے تھے۔ میں جاؤں گا کیوں نہیں! بھابی سے کتابیں مانگ کر لاؤں گا۔" میں نے کمرے سے نکلتے ہوئے پھر کہا۔ پھر ایک اچٹتی ہوئی نظر الماری پر ڈالی۔ اس پر میری تصویر کے نیچے موٹے موٹے حروف میں لکھا تھا "مہاشے رتن سہائے"۔ "یہ کس شیطان نے یہ حرکت کی ہے؟" میں نے ڈانٹ کر نصیر سے کہا، سنتے ہو۔ اگر اب سے ایسا ہوا تو پہلے تم ہی کو ٹھیک کروں گا" میں کمرے سے باہر نکل آیا۔ اور بیچارہ نصیر سوچتا رہ گیا "ایسا کیسا؟"

جب میں شہنا کے کمرے میں آیا وہ سمٹی ہوئی بے خبر سو رہی تھی۔ اس کا داہنا ہاتھ مسہری سے الماری کے پاس لٹک رہا تھا۔ میرا جی چاہا ان انگلیوں سے روئی لگا کر کیوں نہ "فاختہ" چھوڑ دوں؟ میری جیب میں دیا سلائی موجود تھی۔ لیکن یہ نازک انگلیاں۔ مجھے بڑا افسوس ہو گا۔ لوگ کسی کو جلا کر کیسے خوش ہوتے ہیں۔

جیسے ہی میں کتاب نکالنے کے لئے جھکا۔ میری گردن پر کسی نے زور سے کاٹا۔ میں تلملا اٹھا۔۔ دیکھا تو شہنا بے خبر سو رہی تھی۔ "شاید چیونٹی"۔ میں کتاب لے کر گردن سہلاتا جب کمرے سے نکلا تو میرے کانوں میں آواز آئی "چور!" اس وقت مجھے اپنے پر غصہ آیا میں نے کیوں نہ پہلے ہی ان انگلیوں

پر فاختہ چھوڑی ؟ ۔

" انگوٹھی کی مصیبت ! بڑی دلچسپی سے ختم کرتے ہوئے میں نے کہا غریب! بچاری لڑکی! اُسی وقت مجھے شہنا یاد آ گئی بچاری! بچاری! میں نے اپنے پہلے خیال کی تردید کرتے ہوئے سوچا اگر بیرسٹر کی جگہ میں ہوتا ۔ تو کیا کرتا؟ ایک کی جگہ دو انگوٹھیاں اور پہنا دیتا ۔ کہ اور کسی کے ہو چٹکی لو" میں نے آئینہ میں دیکھا ۔ میری گردن کا چمڑہ تک شہنا کے ظالم ناخن کے ساتھ چلا گیا تھا ۔ ۔۔۔ "اللہ سمجھے اس سے" اپنے زخم پر ہاتھ پھیرتے ہوئے میں نے کہا ۔۔۔

دوسرے دن میں نے سارا کمرہ چھان مارا ۔ میرا سلیپر غائب تھا ۔ اُسے ڈھونڈتے ڈھونڈتے جب تھک گیا ۔ تو دیکھا وہ کپڑوں کی کھونٹی میں الٹا لٹک رہا ہے ۔ جگہ جگہ بلیڈ سے کٹا ہوا دیکھ کر مجھے بڑا افسوس ہوا ۔ اور یہ ! یہ کمرے کی دیوار ۔ دریچوں کے شیشے اور کیلنڈر کے سارے اوراق پر نمایاں طور پر لکھا ہوا ۔

" رتن جی " ۔۔۔۔ " رتن " !

کمرے کی خاموشی میں میں زور سے ہنس پڑا " اچھا شہنا کبھی بدلہ لوں گا " ۔

شہنا نے مجھے دیکھ کر بڑی سنجیدگی سے پوچھا " یہ گردن پر زخم کیسے آیا " زیدی ۔۔۔۔ " ! کیسے ؟ میں نے اس کے نازک ہاتھ میں زور سے چٹکی لیتے ہوئے کہا " ایسے شہنا ! "

وہ ہنس دی " تو پھر تم نے بلا پوچھے میری کتابیں کاہے لیں " ۔ اُس

کی شوخ آنکھوں میں چمکتے ہوئے آنسو دیکھ کر مجھے بڑی خوشی ہوئی۔۔۔

ہو زیدی باغ چلو گے۔" بھابی نے مجھے پکارتے ہوئے کہا۔ چلتی ہو شہنا؟ وہ بڑے پیار سے بولیں ۔۔۔ "نہیں آپا ۔۔۔ اب وہاں نہ جاؤں گی۔ دیکھو تو تمہارے باغ کے اُلّو نے مجھے کاٹ کھایا"۔ وہ اپنا ہاتھ دکھاتے ہوئے بولی ۔۔۔ "تو اور دن بھر اُلوؤں کے گھونسلے ڈھونڈتی پھرو ۔۔۔ زیدی! کہیں اُلو کے دانت زہریلے تو نہیں ہوتے؟" پریشان لہجے میں بھابی نے مجھ سے پوچھا ۔۔۔ بھابی کے پیچھے سے شہنا نے آہستہ سے کہا "اُلّو" ۔۔۔ اور پھر وہ ہنستی ہوئی بھاگی۔

مجھے شہنا پر بڑا غصہ آرہا تھا "کیسی خراب لڑکی ہے وہ! اور جو کہیں کہہ دیتی۔ کہ زیدی نے کاٹا ہے تو پھر؟ ۔۔۔ کیا کہتیں بھابی، تھوڑی دیر بعد وہ ایک لمبا سا بانس لئے باغ میں آپہنچی! "آپا امرود کھاؤ گی؟ ۔۔۔ اور تم! تمہیں بھی چاہئیں زیدی؟" اُس نے اپنے منہ میں امرود بھرتے ہوئے کہا۔

"یہ اتنا لمبا سا بانس کہاں سے لے آئی شہنا؟"

"بڑی مشکلوں سے آپا ۔۔۔ اس اندھیری کال کوٹھڑی میں سے نکالا ہے۔ دیکھو تو میرے ہاتھ بھی چھل گئے"! اُس نے اپنا ہاتھ دکھاتے ہوئے کہا۔ چھل گئے ہیں تو میری بلا سے! اس سے دو کام تو لُوں گی۔" ایک تو یہ امرود" اس نے دیوانوں کی طرح شاخ کو پیٹتے ہوئے کہا۔ "اور ایک اُس اُلّو کو سزا

دوں گی۔"

آپا امرود چُنتے ہوئے بولی —— "ہاں جیسے اُلو بیٹھا ہی تو ہو گا!"

"ہاں آپا وہ بیٹھا ہوا ہے۔" اُس نے اپنی شوخ آنکھوں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ اپنا لمبا بانس گھسیٹتی ہوئی درختوں میں چھپ گئی۔ یکایک وہ زور سے چیخی:۔ سانپ! سانپ! زیدی جلدی آؤ!

میں جیسے ہی دوڑتا ہوا اُس کے پاس پہنچا۔ وہ اپنا بانس شہد کے چھتے میں زور سے مار کر بھاگ چکی تھی!! اور شہد کی مکھیاں بھنبھنا بھنبھنا کر اُڑنے لگیں۔ میں بے طرح بھاگا۔ مگر بھاگتے ہوئے بھی دو چار مکھیاں اس طرح مجھ سے چمٹ گئیں۔ کہ چھڑانا مشکل ہو گیا۔ ناک کے اوپر ٹھیک پیشانی کے نیچے ایک مکھی نے تو اس بُری طرح سے کاٹا کہ خون تک بہنے لگا۔ جا بجا ہاتھ گردن اور مُنہ پر مکھیوں نے جی بھر کر ارمان نکالے تھے۔ میں درد سے تڑپتا ہوا جب اپنے گھر کی طرف بھاگا۔ تو شہنا کی ظالم ہنسی میرے کانوں میں ہتھوڑے لگا رہی تھی۔

ساری رات میں درد اور بخار سے تڑپتا رہا! خدا غارت کرے اسکول کی ان بدتمیز لڑکیوں کو! میں نے شہنا کو دل کھول کر کوسا۔ اس رات کو تخیل میں شہنا مجھے ایک خونخوار دیونی کی طرح نظر آ رہی تھی۔

اور جاؤ! ـــــ اور ـــــ کتاب لینے گئے تھے۔ میں نے اپنے پر بگڑتے ہوئے کہا ـــــ اور پھر! میں اس بدتمیز لڑکی سے بولا ہی کیوں تھا؟ بڑے چٹکی لینے گئے تھے۔ ٹھیک ہوا بہت ٹھیک۔

میرا سارا منہ پھول کر کپا بن گیا تھا۔ میں ایک ہفتہ بالکل اپنے کمرے سے باہر نہ نکلا ـــــ

بھابی خاص طور پر مجھے دیکھنے آئیں! انہیں دیکھ کر مجھے بڑا غصہ آیا۔ بہن کو بلایا ہے! جیسے چھٹی گزارنے کی اور کوئی جگہ تو رہی ہی نہ تھی۔ اچھے خاصے گھر میں بھوت کو بلا رکھا ہے۔ اور اب آئی ہیں مجھے دیکھنے ـــــ!

ایک روز میں کمرہ بند کر کے کہیں گیا ہوا تھا۔ آ کر جو دیکھتا ہوں تو ساری چیزیں زمین پر بکھری پڑی ہیں۔ میرا کوٹ اور بچارا ہیٹ ایک کونے میں پڑا تھا۔ تصویریں کچھ الٹی اور کچھ ٹوٹی ہوئی تھیں۔ میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا ـــــ یہ کون میرے بند کمرے میں آ کر طوفان مچا گیا؟ ـــــ کس نے ایسا کیا؟ شاید بلی ہو ـــــ مگر یہ ایک ہی طرف کی چیزوں پر آفت کا ہے آئی۔ شاید بھوت ہو ـــــ بھوت!

دوسرے اور تیسرے روز بھی یہی ہوتا رہا۔ آخر ایک بار تھک کر میں کمرے میں چھپ گیا ـــــ تھوڑی دیر بعد دیکھا وہی لمبا بانس بھابی کے کوٹھے سے میری دریچی میں ہوتا ہوا آیا۔ اور پھر وہی طوفان بدتمیزی ـــــ! میں نے

اتنے زور سے بانس کو کھینچا کہ بی شہنا کی انگلیاں ہی تو جانتی ہوں گی!

اب شہنا سے میری لڑائی ہو گئی۔ اور آخر ہوتی بھی کیوں نہ۔ میری کتنی چیزیں اس منحوس بانس کی بھینٹ چڑھ چکی تھیں۔ اور سب سے بڑھ کر پروفیسر گیان چند کے لکچر والی کاپی، وہ تو ساری کی ساری روشنائی سے لتھڑی پڑی تھی۔ توبہ! توبہ! دماغ خراب ہو جائے انسان کا! میں نے جھلا کر دریچی بند کر دی۔

ایک روز میں بے خبر سو رہا تھا — یک بیک ایسا معلوم ہوا۔ جیسے کسی نے لپکتا ہوا شعلہ میرے پیر پر رکھ دیا ہو۔ ایک جست لگا کر میں چیخ اٹھا — جلتی ہوئی روئی اور بالوں کی بدبو کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔ اور شہنا دریچی سے لگی مسکرا رہی تھی۔ اسے گھورتے ہوئے میں نے کہا "یہ تم نے مجھ پر فاختہ کیوں چھوڑی؟" — "میں جا رہی ہوں زیدی!" اس نے میری باتوں کو ان سنا کرتے ہوئے کہا — "تم جاؤ! تو جاؤ! مگر یہ میرے پاؤں پر فاختہ کا ہے چھوڑی"؟ "اس لئے کہ میں جا رہی ہوں!"

"تو کیا جانے والے ایسا ہی کرتے ہیں؟ — میں نے سختی سے کہا۔

"اچھا تو آپ غصہ بھی ہو لیتے ہیں کبھی کبھی"؟ — ارے تم نے یہ کس کی تصویر لگا رکھی ہے فریم میں؟ توبہ! توبہ! اوق ...... وہ

میری چیزوں کا جائزہ لیتے ہوئے بولی۔ تھو! تھو — ! کیسی چپٹی سی ہے، اور مُنہ کیسا لگ رہا ہے۔ تھُو! اوق تھُو! — جی متلا گیا — دو بھائی — الائچی دو —"

کواڑ سے لگی ہوئی شمّو زور سے ہنس پڑی "یہ نزہت آپا ہیں۔ انہی سے تو بھیّا کی شادی ہو گی۔" اُس نے سنجیدگی سے اپنی آنکھیں پھاڑتے ہوئے کہا "ایمان سے" اور پھر ایک تیز قہقہہ لگا کر بھاگی ——! رتن سہائے اُلّو کی بیوی اور آخر کیسی ہوتیں؟"

مجھے شمّو پر بڑا غصہ آیا۔ اِس نے اُس بدتمیز لڑکی سے کاہے کہہ دیا۔

دوسرے روز جب میں بھابی کے یہاں گیا۔ تو مکان ہلکا ہلکا سا لگ رہا تھا۔ جیسے کوئی بہت بڑا دیو اسے خالی کر گیا ہو۔ بھابی سُست تھیں۔ میں نے بھی محسوس کیا۔ ایک اداسی گھر پر چھائی ہوئی تھی۔ ایسی جیسی مسجدوں میں شیطان نہ رہنے سے ہوتی ہے!

اُس کے جانے کے بعد میں نے کمرے کو نئے سرے سے صاف کیا۔ جگہ جگہ بانس کے کھرچے دیواروں پر لگے ہوئے تھے۔ چونہ گردانی کے بعد جب میں اپنے کمرہ میں آیا۔ تو بڑی خوشی ہوئی۔ دیواروں پہ لکھا ہوا رتن اب کہیں نہ تھا۔

جب میں چیزوں کو ترتیب دینے لگا۔ تو دیکھا چھوٹی میز پر شہنا

نے کسی نوکیلی چیز سے کھود کر "رتن" لکھا تھا۔ میں نے دیوار کو دیکھتے ہوئے سوچا، شریر شہنا نے یہاں بھی تو لکھا تھا۔ اور جب میں نے اپنی انگلیوں سے وہاں کا چونہ جھاڑ دیا تو یہ دیکھ کر مجھے بڑی ہنسی آئی۔ کہ وہاں بھی لکھا ہوا چمک رہا تھا۔ "رتن"

میرا بی۔ اے کا فائنل امتحان ہو رہا تھا۔ جب کالج سے تھک کر میں کتاب اور کاپیاں میز پر ٹپکتا۔ تو سامنے کی دیوار ہنستی ہوئی کہتی "رتن" اور بلیڈ سے کٹا ہوا سلیپر میرے پاؤں میں کھلکھلا اٹھتا۔ شہنا کو گئے ایک طویل مدت ہو چکی تھی۔ پھر بھی وہ مجھے اکثر یاد آ جاتی — !

ایک دن بھابی نے مجھ سے خوش ہو کر کہا "شہنا امتحان دے کر آ رہی ہے۔ اللہ رحم کرے! میں نے گھبرا کر کہا۔

"شریمان رتن جی نمسکار" وہ اپنی شوخ آواز میں موٹر سے اترتی ہوئی بولی۔

"کالج کی مہذب سوسائٹی میں رہ کر بھی یہ ویسی ہی شیطان رہی" میں نے اپنے دل میں مایوس ہو کر کہا۔

وہ بالکل پہلے جیسی تھی — وہی ہنسی، اسی طرح ہنستے ہنستے یکایک بھاگ جانا —

مگر اب اس کی آنکھوں میں شوخی اور شرارت کی بجلیوں کے ساتھ ایک

لطیف سا حجاب بھی پیدا ہو گیا تھا — اور قہقہوں کی گونج میں ایک موسیقیت پنہاں تھی — ایک دن اُس نے جلتی ہوئی دیا سلائی میری انگلیوں پر رکھ دی۔ چمکتے ہوئے آبلوں کو دیکھ کر میرے دل میں ایک عجیب سی تمنا ہوئی "کاش! یہ ہمیشہ ایسے ہی چمکتے رہیں!"

ایک روز اس نے مجھے دیکھتے ہی شور مچایا — "میں نے آخر تمہاری تزہت کو دیکھ ہی لیا نا! وہ اونچی مسہری پر بیٹھی پاؤں ہلا ہلا کر زور سے ہنستی جا رہی تھی۔ ایک کوّے کا خاندان تمہارے دم سے بھی آباد ہو گا — تم بھی کالے! وہ بھی کالی۔ خوب۔ خوب! وہ قہقہہ لگا کر بولی۔

شہنا مجھے روکتی رہی، لیکن میں جلد ہی چلا آیا۔ اُس روز مجھے دیر تک نیند نہیں آئی۔ دوسرے روز جب میں نے شہنا کو دیکھا۔ تو وہ بالکل چُپ تھی۔ ایسی چُپ کہ تھوڑی دیر بعد اُس بھیانک خاموشی سے میرا دم گھٹنے لگا۔ میں سمجھ گیا۔ وہ رات میرے خاموشی سے چلے آنے کی وجہ سے خفا تھی۔ خدا جانے میں نے کتنی باتیں کر ڈالیں۔ مگر وہ چپ سوئٹر بننے میں مشغول رہی۔

"اگر اسی طرح تم چپ رہیں۔ تو نجانے میں کیا ہو جاؤنگا۔"

میں نے ایک ننھا سا پتھر اُس کی گود میں پھینکتے ہوئے سوچا۔

عجب لڑکی ہے شہنا بھی! —— وہ اُسے پڑھ کر زور سے ہنس دی "تم - تم پروفیسر تو کبھی نہیں بن سکتے۔ لڑکے تمہیں ہوٹ کر دیں گے۔ سمجھے! ہاں!" وہ گردن ہلا کر بولی "تم ڈپٹی مجسٹریٹ ہو جاؤ گے!"

بھابی زور سے ہنس دیں "بی۔ اے کے بعد ہی فکر پڑ گئی" میں بھی کھسیانا ہو کر ان کے ساتھ ہی ہنس پڑا ––

شہنا جلد ہی واپس چلی گئی۔ ریل کی کھڑکی سے سر نکالے وہ دیر تک مجھے دیکھتی رہی! دور ہوتے ہوئے اس کی آواز آہستہ سے آئی "رتن"۔

اور میں نے گارڈ کے آخری ڈبہ کو دیکھتے ہوئے سوچا "پھر وہ کب آئے گی"؟

میں نے اُس دن نزہت کی جگہ شہنا کی تصویر فریم میں لگا لی۔ دن کا بیشتر حصہ کتاب اور کالج میں گزار کر میں اکثر یہ سوچتا رہتا۔ پھر وہ کب آئے گی!؟

# شفیق

مجھے اپنے اُس غریب دوست سے بے حد محبّت تھی۔ کبھی اُس کی بہتی ہوئی گندی ناک سے گھن نہیں آئی۔ وہ زیادہ تر ایک ہی جگہ بیٹھا اپنی چھپاتی ہوئی آنکھوں سے مکھیاں اڑایا کرتا۔ اُس کے بھورے بالوں نے جٹاؤں کی صورت اختیار کر لی تھی۔ اور کرتے کے دونوں آستینوں پر کہنیوں تک ناک کی غلاظت جمی رہتی تھی۔

ساری لڑکیاں مجھ سے جھگڑ کر علیحدہ ہو گئی تھیں۔ انہیں یہ شکایت تھی۔ کہ آخر میں اُن پر کیوں حکم چلاتی رہوں۔ میرے بس کی بات نہ تھی۔ بھلا

میں یہ کیسے گوارا کر لیتی۔ کہ میں اُن سے بڑی ہو کر بھی لونڈیوں کی طرح دوڑ دوڑ کر ان کا کام کرتی پھروں۔ لیکن میرے عزیز دوست نے کبھی اس کا شکوہ نہیں کیا۔ کہ ہمیشہ وہ دربان ہی بنتا رہے۔ شاید ایسے موقعوں پر اسے اس بات کا یقین رہتا تھا۔ کہ اُس کی تخلیق ہی ایسی اداکاری کے لئے ہے وہ اطمینان سے اینٹ کے بے ڈھنگے ڈھیر پر بیٹھا گاہے گاہے اپنی چندھی آنکھوں پر دوہتڑ لگا کر مکھیوں کو مارتا رہتا۔

ایک روز میں دیر سے شفیق کا انتظار کر رہی تھی۔ اتنے میں وہ بھویں تلائے، منہ پھاڑے بمشکل اپنی آنکھیں کھولنے کی کوشش کرتا ہوا خوش ہو کر بولا "بڑی اچھی چیز لایا ہے رانو بی بی۔ دیکھو نے ای بھونا" اس نے اپنی پھولی ہوئی جیب دکھاتے ہوئے کہا۔

"کچھا دے رانو۔ بڑا اچھا ہے جی" میں نے اُسے گھورتے ہوئے کہا۔ میں تیرے گندے جیب کا نہیں کھاتی۔ دُور ہو" میری باتوں کو سُن کر وہ ایسے چُپ ہو گیا۔ جیسے اُس کو یہ یقین تھا۔ کہ میں بھُونا دیکھتے ہی سارا جھپٹ کر کھا جاؤں گی۔

"ہم اپنے نانا سے تم ہی لاتو مانگ کے لایا تھا۔ رانو" وہ آہستہ سے بولا ——!

"دیکھ تو تیرے جیب کے پاس کتنا میل ہے! کیسے اس میں کا کھالوں

میں نے مُنہ بناتے ہوئے کہا۔

"جیب کے اندر تو نانے میل ہے" اُس نے مری ہوئی آواز میں مجھے تکتے ہوئے کہا۔ "اور جو تم ہم کو حلوا پڑی دو ہو، تو ہم کیسے کھا جا ہیں۔"

تو کیا تیری طرح میں بھی ایسے ہی گندی میلی کچیلی رہتی ہوں۔ دیکھ تو، میری جیب کیسی صاف ہے۔"

"جیب نے میلا ہے! مگر بھُونا کہاں میلا ہوا ہے رانو" وہ مکّی کا سفید سفید لاوا دکھاتے ہوئے بولا۔

"اور یہ جو تیرے ہاتھ پر اتنی مکھیاں لگ رہی ہیں سُوا! اچھا تو میرے جیب سے تم ہی نکال لو"۔ اور جیسے ہی میں نے اس کی جیب میں ہاتھ ڈالا تھا۔ کہ شیطان کے بچّے منیر نے چیخ کر اماں سے کہہ دیا "یہی دیکھئے رانو، شفیق کے جیب کا بھونا کھا رہی ہیں۔"

"اماں نے گرج کر کہا، "لا تو اُسے پکڑ کر" میں بھُونا وونا چھوڑ کر باہر بھاگی۔ دروازے سے چھُپ کر دیکھا۔ بچارہ شفیق اپنا گرا ہُوا لاوا اُٹھا اُٹھا کر جیب میں بھر رہا تھا۔

دوسرے دن جب میں اُسے تربوز کی قاش دینے لگی تو اُس نے للچائی نظروں سے اُسے تکتے ہوئے کہا۔

"اب ہم بھی نا لیں گے۔ تم ہی نے کل میرا بھُونا پھینک دیئو تھا نہ"

"ارے ہیں نے پھینکا تھا؟ کہ منیر نے اماں سے کہہ دیا تھا! تو نہیں جانتا سب کہتے ہیں نا کہ شفیق کے یہاں کی کوئی چیز مت کھاؤ نہیں تو مر جاؤ گی۔"

جاؤ رانو۔ تو ہم بھی اب تمرے ساتھ نا کھیلیں گے۔ اُس نے رُوٹھ کر کہا۔

"ارے سُن تو۔ دیکھ سب سے چھُپا کر وہ بھونا لا دے۔ سمجھا۔" میں نے اُسے مناتے ہوئے کہا۔

تو میرے گھر چلو نے "اچھا چل، مگر کسی سے کہے گا تو نہیں نا"؟

میں اماں سے چھپ کر ڈرتی ڈرتی شفیق کے گھر پہنچی۔ اس سے پہلے میں کبھی ایسے مکان میں نہیں آئی تھی۔ پھُونس کا ٹوٹا پھُوٹا سیاہ چھپر ہیبت ناک بھُوت کی طرح اُن کے سروں پر اُوندھا ہوا تھا۔ اور مٹی کی ٹیڑھی ترچھی دیواریں ایسی معلوم ہو رہی تھیں جیسے سُوکھے ہوئے حلقوں سے یہ گھر گھراتی سانس کو بھی اپنے ڈراؤنے پنجوں سے گھونٹنا چاہتی ہوں۔

میں نے شفیق کے خوبصورت چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا "تو کہاں پر سوتا ہے شفیق؟"

"ہم ہییہاں پر سوئیں ہیں۔" وہ میرا ہاتھ پکڑ کر ایک طرف لے گیا۔

اللہ۔ میں حیران رہ گئی ۔ ڈربہ پہ سوتا ہے شفیق ؟" اور مرغی کی ساری جوئیں جو تیرے کپڑے پہ چڑھ جاتی ہونگی"

"تو پھر کہاں پہ سوئیں رانو۔ دیکھو تو نیچے بکری بندھی رہتی ہے۔ اُس کونے میں نانا سوئیں ہیں۔ اور ہم کو اپنے پاس سولاویں ہیں۔ اور ماں کہتی ہے کہ او کوٹھری کی دیوال گر جاگی ——"

"دیکھو اس ڈربہ میں میری چار مُرغی ہے۔ اور بکری کو بھی دو بچہ ہوا۔ ای دیکھو ہم سیم کا بیج بویا ہے۔ اور ای کدو کا، جب پھلے گا نہ، تو تم کو بھی دیں گے۔ اور ہاں میرے ایک نانا بھی ہیں۔ چلو تم کو دکھادیں"

وہ میرا ہاتھ پکڑ کر ساری چیزیں دکھا رہا تھا۔ اور جب میں بکری کی مینگنیں بہتے ہوئے کیچڑ اور مرغی کی گندگی سے ہوتی ہوئی، اُسارے کے دوسرے کونے میں چھپاتے ہوئے ٹاٹ کے پردے کے پاس پہنچی۔ تو میرا جی متلانے لگا۔

"ساپھو!" پردے کے پیچھے سے آواز آئی۔ وہ میرا ہاتھ پکڑ کر ٹاٹ کے اُس پار لے گیا۔ اللہ۔ میں بت بنی کھڑی رہی۔ انسان اس صورت میں بھی پیدا کیا جا سکتا ہے ؟" میں سوچنے لگی "اللہ میاں کو اسے بناتے وقت گھن بھی نہ آئی تھی" "ساپھو تو صبح سے کہاں گیا تھا بیٹا ؟ دیکھ تو تیرے لایہ لگڑی رکھا ہے۔" گوشت کے اس مکروہ

لو تھڑے میں اک جنبش ہوئی۔ اور میں حیران رہ گئی۔ سیاہ لال لال زخموں سے بھرے ہوئے ہاتھ کی ساری انگلیاں غائب تھیں "نانا دیکھو تو۔ رانو بی بی تم کو دیکھنے آئی ہیں" شفیق جوشِ مسرت سے چیخ کر بولا "کہاں ہیں بیٹا کہاں؟" وہ انتہائی خوشی سے بڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ اُس نے اپنی چندھی آنکھوں پر سے بھنبھناتی ہوئی مکھیوں کو اڑاتے ہوئے کہا۔ "جیتی رہو بیٹی تمہیں دیکھ کے بڑا جی خوش ہوا۔ کاہے کھڑی ہو؟ —— ! جا بیٹا —— ! پھوپھی کا پیڑھا اُٹھا لا" —— شفیق دوڑ کر پیڑھا اٹھا لایا۔ لیکن میرا دماغ چکرا رہا تھا۔ زخموں کی سڑی ہوئی سڑاند سے میری ناک پھٹی جا رہی تھی۔ چپچپاتی ہوئی زمین کے پاس نالی کے جمے ہوئے سبز کیچڑ اور ہلتے ہوئے ٹاٹ کی بدبو سے میرا دم گھٹ رہا تھا۔ اور سب سے بڑھ کر گندے اور غلیظ کپڑوں کے ڈھیر سے چمٹا ہوا یہ انسان۔ جس کے بدن کے اکثر حصے بجبجاتے ہوئے زخم بن کر بُری طرح بدبو پھیلا رہے تھے۔ مجھے ایسا معلوم ہو رہا تھا۔ جیسے اب اِس ہیبت ناک فضا میں گھٹ کر مر جاؤں گی" بڑی حسرت سے میری آنکھوں میں میرا صاف اور بہترین مکان گھومنے لگا۔ آج کس کا منہ دیکھ کر اُٹھی تھی، میں نے دل میں سوچا۔ اب اگر یہاں سے گئی۔ تو پھر کبھی نہ آؤں گی۔

"تم کاہے چُپ ہو رانی بی بی؟" شفیق نے مہربان میزبان کی طرح پوچھا۔

"سا پھو! تمری بڑی تعریف کرتا رہے ہے۔ بیٹی۔" بڈھے نے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کی آنکھوں کو دیکھتے ہی میری آنکھیں جھک گئیں۔

آہ! ان بے پلکوں کی، سُرخ، پھولی ہوئی کناروں والی آنکھوں میں کتنی آرزوؤں کا خون جھلک رہا تھا۔ اُس کے چہرے کے سیاہ زخموں سے بھرے ہوئے خدوخال پر کیسی غمناکی چھائی ہوئی تھی لیکن اُس کے لبوں پر ایک افسردہ سا تبسّم تھا۔ وُہ اپنے پیلے پیلے دانت نکال کر اپنی حسرتوں کو چھپا رہا تھا۔ زندگی کی ایک لرزتی ہوئی ہلکی سی لہر اس کے لبوں پر دوڑ رہی تھی۔ اور وُہ اپنی ساری مصیبتوں کو اپنے اس ادھورے سے تبسّم میں بھُلا دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ بڈھا اپنی پیپ سے لتھڑی ہوئی انگلیوں سے بمشکل بانس کا پنکھا لے کر میرے نزدیک کھسک آیا "بڑی گرمی ہے بیٹی۔" اُس نے بڑی محبت سے کہا۔ "تم کو سا پھو بہت چاہتا ہے۔ ہر دم بس تم ہی کو یاد کرتا رہے ہے تم بھی تو اُس کا بڑا خیال کرو ہو۔ اسی لیئے تو بیٹی تم ہم سب کے لیئے سب ہی کچھ ہو۔ یہی ایک بچارا بچ رہا ہے۔ سب ہی مر گئے۔ بیٹی تم میرے بچّہ

کو کتنا پیار کرتی ہو۔ اسی لئے تو اگر تم کہو تو ہم اپنے کھال کا جوتا بنا کر تمہیں خوشی سے پہنا دیں۔"

ان سیاہ، بجبجاتے ہوئے دانوں سے بھرے ہوئے چمڑے کا جوتا ——؟ ایمان سے! میں تو کبھی نہ پہنوں گی۔ میں نے کانپتے ہوئے اپنے پیر کی طرف یوں دیکھا جیسے میں اس کے چمڑے کا جوتا پہنے کھڑی ہوں۔

شفیق بڈھے کی گٹھڑی سے لکڑی نکال کر توڑتے ہوئے بولا۔ "بہو نا تو سب ختم ہو گیا۔ رانو یہی لو۔ ادھا ہم ادھا تم۔" لیکن بڈھا اس کے ہاتھوں پر جھپٹ پڑا۔ "نا سا پھو۔ رانو بی بی کو مت دے" "کاہے نانا؟ تو ہم کیسے کھائیں؟" اس نے بھولے پن سے پوچھا "تو تو میرے ساتھ ہر دم سے ہے بیٹا" اس نے اپنی جھڑی ہوئی انگلیوں کو دیکھتے ہوئے ٹھنڈی سانس بھری۔

شفیق مجھے میرے گھر تک پہنچانے گیا۔ لیکن میں راستہ بھر ایکدم چپ رہی۔ مجھے تو ایسا لگ رہا تھا۔ جیسے جان چھڑا کر دوزخ سے بھاگی آ رہی ہوں۔ میرا جی متلا رہا تھا۔ اس روز میں نے کھانا بھی نہ کھایا۔

منیر دروازے پر بیٹھا شفیق کو چڑا رہا تھا۔ جب تیرے نانا کو

ہم ڈنڈا سے ماریے کو ڈراویں - تو بڈھا کیسے رونے لگے ہے "۔ میں کانپ اٹھی - اِن سُرخ پھولی ہوئی کناروں والی آنکھوں سے کیسے آنسو بہتے ہوں گے !

مجھے بار بار شفیق اپنے گھر جانے کو کہتا - لیکن میں لرز جاتی " نہیں شفیق ! مجھے ڈر لگتا ہے - تیرے بچارے نانا کی اُنگلی دیکھ کر بہت افسوس آتا ہے " " کاہے کو افسوس لگے ہے رانو - ؟ او تو اللہ میاں ایسا بنائیں ہیں "

" نہیں رے شفیق، اللہ میاں نے ایسا نہیں بنایا ہے اماں کہتی ہیں - اُن کو بیماری ہے "

" ہاں - بیماری ہے " اُس نے چڑ کر کہا " تو کہاں ڈاکٹر آوے ہے ؟ اور دوا کی شیشی کہاں رکھی رہے ہے - ؟ تم جو بیمار تھیو تو کتنی شیشی تھی ٹیبل پر " - مجھے شفیق کی باتوں پر یقین آگیا -

" تو اللہ میاں نا اچھے ہیں - تیرے نانا بچارے کی اُنگلیاں اُنہوں نے نہیں بنائیں - اور اس کے بدلے میں اتنے بڑے بڑے زخم دے دیئے - توبہ ہم تو نہیں بولتے اللہ میاں سے ایک دم خراب ہیں وہ "

" اللہ میاں کو بُرا نہ کہو رانو " اِس نے پریشان ہو کر کہا - میں

اسکول بند ہونے پر جب دو مہینے بعد گھر پہنچی۔ تو اماں نے افسردہ لہجے میں کہا۔ "ریالو ــــ! تیرا شفیق بچارا ــــ!" "کیا ہوا اماں"؟ میں نے بے صبری سے کہا۔ "وہ بچارا اُس مہینے ہیضہ سے مر گیا" ــــ! مر گیا۔ میرے کانوں میں دیر تک یہ گونجتا رہا۔ میں بہت دیر اُس لئے روتی رہی۔ کاہے مر گیا وہ۔ اب کون میرے ساتھ کھیلے گا؟ ــــ

جب میں نے اپنے آنسو پونچھ ڈالے۔ تو مجھے خیال ہوا۔ اماں نے مجھے چھیڑنے کو کہدیا ہوگا۔ میں دوپہر کو سب سے چھُپ کر شفیق کے گھر گئی۔

بچارا نانا۔ وہ مجھے دیکھتے ہی پھُوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اور اُس کے ساتھ ہی میں بھی آہستہ آہستہ دیر تک روتی رہی۔ بڈھا نانا اُس کو کتنا چاہتا تھا۔ مجھے اُس روز ذرا متلی نہیں آئی۔ وہ بہت دیر تک مجھ سے شفیق کی باتیں کرتا رہا۔ بچارہ مرتے وقت بھی مجھے یاد کر رہا تھا۔ میں روز اپنے شفیق کی باتیں سُننے بوڑھے نانا کے پاس جاتی۔ اب مجھے ٹاٹ کے پردے سے گھن نہ آتی۔ مجھے اس ٹاٹ اس بھنگی ہوئی زمین اور زخموں سے بھرے ہوئے بڈھے سے محبت ہو گئی تھی ایسا معلوم ہوتا۔ اسی ٹاٹ سے شفیق لپٹا تھا۔ اسی زمین پر وہ بیٹھا رہتا تھا۔ اور اُسے اپنے نانا سے کتنی محبّت تھی۔ پھر میں اُسے کیوں نہ چاہتی۔ وہ

میرے شفیق کا نانا تھا۔ میں اکثر اپنے نعمت خانے سے اپنے بچارے شفیق کا حصّہ حلوہ اور پھل چُرا چُرا کر دیتی۔ وہ اپنی پچپاتی ہوئی انگلیوں سے پکڑ کر جلدی جلدی اسے کھانے لگتا۔ جیسے کوئی اُس کے مُنہ کا نوالہ چھیننے کو آرہا ہو۔

شفیق کی ماں فاقے سے تنگ آکر دوسری جگہ نوکری کرنے چلی گئی تھی۔ بچارے بڈھے نانا کو بستی کا کوئی آدمی رحم کر کے کھانا اور پانی دے جاتا۔

میرا اسکول کُھل رہا تھا۔ میں جانے سے پہلے صبح ہی صبح جب اس سے ملنے گئی۔ تو وہ بے خبر سو رہا تھا۔ اور ایک تیز بدبو ہر طرف پھیلی ہوئی تھی —— اس روز پہلے کی طرح پھر میرا جی متلانے لگا۔ لیکن میں نے سوچا وہ شفیق کا نانا تھا۔ میں نے زور زور سے پکارا۔ "میں جا رہی ہوں نانا —— اُٹھو۔ لیکن وہ سویا ہی رہا۔" اچھا تو میں جاتی ہوں۔ تم مت اُٹھو ——!

جب میں گھر آگئی۔ تو کچھ دیر کے بعد منّو نے کہا "بڈھا کوڑھی مر گیا۔ بی بی۔ اب اسے کوئی نہیں چھوتا ہے" منّو نے ہنستے ہوئے کہا۔

"پگلا۔ اُسے چھوئے گا کون؟ —— ارے وہیں پر گڑھا کھود کر

سب اُسے بانس سے دھکیل دیں گے ــــ"!

میری گاڑی رات کی تاریکی میں تیزی سے گزرتی جارہی تھی۔ دُور سے درختوں کی قطاریں یوں نظر آرہی تھیں۔ جیسے کسی کوڑھی کی ٹنڈ اُنگلیاں ہوں۔ اور رہ رہ کر پہیوں کی آواز ایسی معلوم ہورہی تھی جیسے بہت سے کُتّے ایک ساتھ مل کر کسی لاش کو اپنے خونی جبڑوں سے چبارہے ہوں۔ "کرڑ" "یوکرڑ" "چھپڑ" "چھپڑ"۔

اس اندھیرے میں میری آنکھوں سے آنسوؤں کے موٹے موٹے قطرے گرنے لگے۔ لیکن میں انہیں دیکھ نہ سکی۔

# سڑک پر

پنگ پنگ پنگ کی مخصوص آواز کے ساتھ گرلز کالج کی لاری تیزی سے جا رہی تھی۔ میں نے عینک کو اپنی جگہ ٹھیک طرح سے جماتے ہوئے لاری کے نیلے پردے کو تھوڑا سا سرکا دیا۔ موٹر ہسپتال کے احاطے کے قریب سے گزر رہی تھی۔ تیزی سے چلتی ہوئی گاڑی ایک جھٹکے کے ساتھ ایک کوٹھی کے سامنے ٹھہر گئی۔ سینٹ کی تیز لہک اور ریشمی کپڑوں کی لطیف سرسراہٹوں کے ساتھ موٹر چل دی۔ بلند عمارتیں بجلی کی طرح نگاہوں میں کوند رہی تھیں۔ اور ہر روز بس ایک ہی

طرح کے ٹوٹے پھوٹے شکستہ حال مکانوں کے اندرونی اور بیرونی نظاروں سے طبیعت اکتا گئی تھی۔ وہی بے ہنگم سے ٹاٹ کے ربود پردے، اور چھپروں پر گندے کپڑوں کے ڈھیر۔

میں نے پردہ برابر کر لیا۔ لاری کی سیٹیں بھری جا رہی تھیں۔ طرح طرح کی صورتیں کوئی تازہ پھول کی طرح شگفتہ، کوئی پژمردہ۔ کئی نگاہیں تیکھی اور مغرور تھیں، کئی محجوب اور شرمندہ، میں نے نیڈل سنبھالا اور اپنے میز پوش کی نامکمل پتیوں کو بنانے لگی۔ موٹر ہنگ کی ایک آواز کے ساتھ رُک گئی۔ سیاہ ٹوٹے ہوئے جھلملی والے بوسیدہ کواڑوں کو پیچھے دھکیلتی ہوئی ایک لڑکی اپنے ننگے پاؤں کو بدرنگ ساڑھی کے اُڑے ہوئے کناروں سے بمشکل چھپاتی شرمائی ہوئی آکر بیٹھ گئی۔ ڈرائیور روز کی طرح پان چباتا ہوا آگے بیٹھا جملے بازیاں کر رہا تھا۔ جیسے اس کے دامن حسین پھولوں سے بھرے پڑے ہیں۔ اور اُسے سڑکوں پر لمبے گھونگھٹ والیوں کی زیادہ پروا نہیں۔ ٹم ٹم اور بگھی والوں کی چیخ، اکڑتے ہوئے ڈرائیور کی کھڑکھڑاتی ہوئی لاریوں اور بوجھ سے لدے ہوئے رکشا والوں کے تھرتھراتے ہوئے پاؤں کے درمیان لاری آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ جھلملاتی ہوئی دکانوں سے للچائی نظریں نیلے پردے سے ٹکرا رہی تھیں، پان صابن اور پنساری کی دکانوں کے چھجوں اور سڑک پر

کھڑے ہوئے چند لوگ اپنے جبڑوں تک دانت کھولے ہوئے گھناؤنی ہنسی ہنس رہے تھے۔ گندے ٹوکروں اور ٹوٹی ہوئی خوانچیوں میں بدرنگ سوکھے اور سکڑے ہوئے کیلوں اور نارنگیوں کو لئے میلی عورتیں لاری کو دیکھتی ہوئی بار بار اپنا سر کھجلا رہی تھیں، اور نالے سے لگے ہوئے ڈگلوں سے چپک چپک کر چلتے ہوئے کچھ سوکھے لولے اور زرد ہاتھ طرح طرح کی صداؤں کے ساتھ پھیلے تھے۔ میں نے ہینڈل کو تیزی سے چلاتے ہوئے دوسرے ہاتھ کا پردہ چھوڑ دیا۔ روز روز بس ایک ہی منظر دیکھتے دیکھتے طبیعت چڑچڑا رہی تھی۔ مگر پردے کے اندر —؟ وہاں بھی تو ہمیشہ کی طرح وہی صورتیں تھیں اور وہی باتیں۔

زاہدہ نے پیچھے کا پردہ بالکل اٹھا دیا۔ قریب ہی چھوٹی سی پھسلتی ہوئی کار سے دو شوخ نگاہیں ممبلا کی نظروں سے ٹکرا کر مسکراتی ہوئی گزر گئیں۔ تین سائیکلیں لاری کے پیچھے پیچھے سرگوشیاں کرتی ہوئی تیزی سے چکر لگا رہی تھیں۔ میں اپنی جگہ پر سمٹ کر بیٹھ گئی۔ شیاما نے منہ پھیر لیا۔ یاسمین شرما کر بکھرے ہوئے بالوں کو اپنی انگلیوں سے برابر کرنے لگی، اور زاہدہ نے بڑبڑاتے ہوئے ایک جھٹکے سے لاری کا پردہ گرا لیا۔ اڑتے ہوئے پردے سے کچھ دور تک سائیکلوں کے پہیے نظر آتے رہے اور قہقہوں کی کھسیانی آواز سنکر بوڑھی دائی لڑکیوں کو تادیباً گھورنے لگی۔ لاج کا چکّر کاٹتی ہوئی موٹر کدم کنواں

کی طرف جارہی تھی۔ گاڑی اب شہر کے فیشن ایبل حصّے سے گزر رہی تھی۔ پردے آزاد چھوڑ دیئے گئے تھے۔ نئی نئی طرح کی عمارتیں، جھلملاتے ہوئے شیشے اور رنگ برنگ کے لہراتے ہوئے پردے "سینٹ پیٹر" کی خوشبو "سیزن فلاور" کی حسین رنگینیاں، اور لہلہاتی ہوئی بیلوں کی لپٹیں روز کی طرح دعوتِ نظر دے رہی تھیں۔

ساری سیٹیں بھر چکی تھیں۔ بس ایک جگہ بلقیس کی باقی رہ گئی تھی۔ اور بلقیس کا آکر خاموشی سے بیٹھ جانا کوئی اتنا آسان نہ تھا۔ جب تک انہیں کھڑے کی جگہ نہیں ملتی۔ وہ منہ لٹکائے لاری کے چھتے کو پکڑے ہوئے جھومتی رہتی اور اس کے چہیتے کتوں کی وجہ سے لاری کو خواہ مخواہ کی دِقت پیش رہتی۔ پھر سب سے بڑھ کر اُن کے مکان کا وہ ڈھلوان کتنا خطرناک تھا ——؟ ایک روز تو میری عینک ٹوٹتے ٹوٹتے بچی۔ لیکن کر ہی کیا سکتی تھی؟ گرلز کالج کے بڑے بڑے چندہ دینے والوں میں یہ مکان بھی تو تھا —! بادامی رنگ کی وسیع چمکیلی عمارت، سیاہ بورڈر، خوبصورت چوڑے چوڑے سفید موٹے شیشوں والے دریچے اور نازک سے چکر کھاتے ہوئے زینے، بلقیس دُور تک اپنا مکان گھوم مڑ کر دیکھتی رہتی۔ اور اس کے کُتّے اپنے سارے بچوں سمیت لمبے لمبے بالوں کے درمیان چھوٹا چھوٹا منہ کھولے کچھ دُور تک بھونکتے جاتے تھے۔ پھاٹک کے خوبصورت جنگلے سے لٹکے ہوئے نرم نرم روئی کے گالے کی طرح

چھوٹے چھوٹے پلوں کے کھیل سے ڈرائیور ہمیشہ پریشان رہتا تھا۔ لاری کا کسی مکان پر تھوڑی دیر تک بھی ٹھہر جانا بڑا تکلیف دہ ہوتا ہے۔ جب تک موٹر کھڑی رہتی میں بڑی دلچسپی سے سڑک کی ڈھلوان پر بلقیس کی کوٹھی کے احاطے کے قریب ایک چھوٹی سی پان کی دُکان کو دیکھتی رہتی، جو کاٹھ کے چار سیاہ کھمبوں کو گاڑ کر اُن پر ٹین کی چھت ڈال کر بنائی گئی تھی اور کھمبوں کے بیچ میں دیودار کے تختوں کو جوڑ کر ایک تخت کی صورت دے دی گئی تھی۔ اور پھر اس تخت کے نیچے کھمبوں کے نچلے حصے کو تین طرف سے تختوں اور کاٹھوں سے گھیر کر زمین میں ایک کوٹھڑی سی بنا دی گئی تھی موٹر کے رکاؤ کے ٹھیک سامنے اس ننھی سی کوٹھڑی کا کھلا ہوا دَر تھا۔ جس میں کواڑ کی جگہ ایک پھٹا ہوا کپڑا رسی سے لٹکا دیا گیا تھا۔ اور وہ کپڑا ہمیشہ اس طرح سرکایا ہوا رہتا۔ جیسے سچ مچ کے پردے جھول رہے ہوں۔ ایک چھوٹی سی پلنگڑی ایسی ٹھونس کر اُس میں بچھائی گئی تھی۔ کہ اُسے دیکھتے ہی گھٹے ہیں سانس رُکتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ میں اکثر اُسے دیکھتی ہوئی سوچتی کہ اِس کوٹھڑی کی بلندی میں کیا کبھی کسی کو کھڑے ہونے کا اتفاق ہی نہ ہوا ہوگا؟ کوٹھڑی کے آگے اُسی ڈھلوان پر تین چھوٹے چھوٹے بانسوں پر چٹائی رکھ کر شامیانہ بنایا گیا تھا۔ جس کے نیچے ایک چولھا تھا۔ ایک ٹوٹی ہوئی بالٹی، دو تین چھوٹی چھوٹی مٹی کی ہانڈیاں تھیں۔ ایک گردن ٹوٹی صراحی،

ایک چھوٹا سا ٹوٹا پھوٹا، پتھر کا ٹین کو نہ نِل اور اسی طرح کا ایک لے۔ ڈھنگا سا ابھی بھی تھا — صبح کو آتے ہوئے ہمیشہ ایک بیمار سی عورت کو چولہے پر کبھی مولی اور شلغم کے پتوں کا ساگ بھونتے ہوئے دیکھتی۔ جس کے کندھوں سے اکثر پیٹ سے اونچا میلا، گریبان کھلا ہوا کرتہ پہنے اور کبھی ننگے بدن اور سوکھی مری کمر میں نظر نہ لگنے کا میل سے چکٹ ڈنڈا پڑا ہوا بچہ چمٹا رہتا۔ کتنی عجیب سی سڑا ہے تھی یہ زندگی؟ — درختوں کے نیچے، دیوار کے سائے میں کتنی زندگیوں کو رینگتے ہوئے دیکھا تھا۔ مگر یہ سڑک کے ڈھلوان پر ایسی نامکمل مگر چلتی ہوئی زندگی — !

بس ایک طرح سے نیڈل گھماتے گھماتے جی گھبرا گیا تھا۔ دو دن سے انتہائی کوشش کر رہی تھی۔ کہ کسی طرح یہ جلد ختم ہو لے تو اپنے میز پر بچھاؤں بچارا میرا میز ننگا پڑا ہوا کتنا برا معلوم ہوتا ہے میز اور ننگا؟ — اسی لیے تو میں نے اپنا کمرہ ہی بند کر رکھا تھا۔ کہ کوئی دیکھ نہ لے کہیں!

سڑک پر اونچے نیچے قد کے پیٹ پھلائے ہوئے بچے اپنی ناکوں کو سُڑسُڑاتے زور زور سے تالی بجاتے ہوئے چیخ رہے تھے "ہوا گاڑی" "ہوا گاڑی" — پوں پوں والی ہوا گاڑی — کسُم نے منہ بناتے ہوئے کہا "ان کمبختوں کو سردی بھی نہیں لگتی کبھی — ؟ جو ایسے چیخ رہے ہیں۔ اور یہاں شال اور سوئیٹر کے ہوتے ہوئے بھی ٹھنڈ سے آواز نہیں نکلتی۔ بھاگوتی نے اونی چادر لپیٹتے ہوئے کہا۔

"پھر یہ تو دیکھو وہ ننگے بدن ایسے بے پروا اچھل رہے ہیں جیسے انہیں کپڑوں کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔ توبہ! ماں باپ بھی کتنے ظالم ہیں۔ جو اس کڑاکے کی سردی میں گھروں سے انہیں نکلنے دیتے ہیں۔ لیکن یہ جو اس طرح نمونیا و مونیا ہو جائے تو بس رہ روتے پھریں گے"۔

راجکماری کی باتیں سن کر میں نے ایک تیز نظر سامنے والی کوٹھڑی پر ڈالی —— گھر —— ؟ جس کا گھر ہی سڑک اور سڑک کا ڈھلوان ہو وہ کیا کرے! —— ؟

موٹر تیزی سے چل دی، بلقیس کی گود میں ایک خوبصورت پلا کلبلا رہا تھا۔ یاسمین نے اس کے لمبے لمبے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "کسے دوگی بلقیس"؟ —— یہ ہیڈ مسٹرس کے لئے ہے پرنسپل صاحبہ کے واسطے تو ابھی بچے تیار ہو رہے ہیں۔ اسی لئے تو ان کی اتنی حفاظت ہوتی ہے۔ یہاں کسی کے پاس ایسے کتے ہیں ہی نہیں۔ یہ کتے اس طرف آئیں گے بھی کہاں سے؟ خاص کر ابا جان نے یہ جوڑا ولایت سے منگوایا ہے۔ اور اتنی دور سے منگانا کچھ آسان تھوڑا ہی ہے"۔ بلقیس کی باتوں سے جل کر راجکماری گردن پھیر کر باہر دیکھنے لگی۔ اب کالج کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔

قسم قسم کے لڑکے لاری کو مڑ مڑ کر تکتے، اشارے اور جملہ بازیاں کرتے ہوئے فٹ پاتھ پر چل رہے تھے۔ سڑک ختم ہو رہی تھی۔ اپنا کالج قریب تھا۔ میز پوش رکھ کر میں اپنی کتابیں دوہرانے لگی جس کے خیال ہی سے دماغ پھر اُلجھنے لگا۔ اور آج چھ سے سات بجے تک نرسنگ کا لیکچر بھی تو تھا ——— !

پانی زور زور سے برس کر تھم چکا تھا۔ سرد ہواؤں کے ساتھ تھوڑی تھوڑی بوندیں بھی پردے سے اندر آ رہی تھیں۔ اپنا مفلر گردن پر لپیٹتے ہوئے میں نے دونوں طرف کا پردہ ہلا کر زور سے پکڑ لیا۔ لاری رک رک کر لڑکیوں کو اُتار تیزی سے بھاگی جا رہی تھی۔ موٹر میں اب پھیل کر بیٹھنے کی جگہ نکل آئی تھی بلقیس کے مکان کا چھجہ دُور سے نظر آیا۔ وہ اپنی کتابوں کو سمیٹنے لگی۔ موٹر اندھے سکول کے پاس سے مڑ کر سڑک پر جمع شدہ پانی کو اُچھالتی ہوئی جانے لگی۔ بلقیس کے یہاں شاندار پھاٹک کی بلندی پر موٹے شیشے کے بلب میں تیز روشنی ہو رہی تھی۔ اور اس کے قریب ہی اس محبوس سی کوٹھڑی کے بھیگے ہوئے پردے کے شگافوں سے کبھی کبھی مدھم سی شعاع دکھائی دے رہی تھی۔ موٹر سڑک سے ڈھلوان پر اُترتے ہی تیزی

سے پنگ پنگ کرتی پیچھے ہٹی۔ سامنے بجلی کی روشنی میں کتّے کے بھگے ہوئے پلے ایک دوسرے پر اچھل کود کرتے ہوئے کھیل رہے تھے۔ ڈرائیور کی انگلیاں سردی سے شاید ٹھٹھری جا رہی تھیں اس نے زور زور سے ہارن دیا۔ مگر وہ پلّے اس آواز سے مانوس ہو چکے تھے۔ موٹر پنگ پنگ کرتی ہوئی کچھ آگے بڑھی۔ پلّے ڈر کر تیں تیں کرتے ہوئے چیخ پڑے۔ اور اندر سے بھوں بھوں کرتے ہوئے کتّے موٹر پر سامنے سے لپک پڑے۔ ڈرائیور نے کتّے اور پلّوں کو بچاتے ہوئے لاری کو ایک طرف موڑا پیچھے سے "بس بس" "روک کے" کی آواز اور ایک دو زور کی چیخیں بلند ہوئیں، مگر لاری ڈھلوان پر ریت کے گھروندے کی طرح بالس، کاٹھ، ٹین اور چٹائی کو ایک ہچکچاہٹ کے ساتھ روندتی ہوئی کچھ دور تک تیزی سے لڑھکتی چلی گئی۔ بلقیس رو رہی تھی۔ نوکر دل کی اس بے احتیاطی سے کہیں بچارے پلّے مر جاتے تب! ——

ڈرائیور چیخ چیخ کر گالیاں دے رہا تھا۔ "اندھے کہیں کے ایسے بھی چلتی ہوئی سڑکوں پر قلعے بنائے جاتے ہیں۔ اور کوئی اسپرنگ یا شیشہ جو ٹوٹ جاتا تو کون دیتا؟ موٹر زور سے ایک جھٹکے کے ساتھ واپسی کے لئے مڑی۔ لاری کے پردے اٹھے ہوئے

تھے۔ گول بلب کی روشنی کے سہارے بچارا پان والا کچھ ڈھونڈھ رہا تھا۔ اور وہ بیمار سی عورت اپنے بھیگے ہوئے آنچل سے بچے کو چھپائے بانس اور کاٹھ کے چھوٹے سے ڈھیر کے پاس بے سرو سامان کھڑی چاروں طرف تک رہی تھی۔ بوندیں زور سے پڑنے لگیں۔ لاری احاطے کے سامنے سے گزری، کُتّے اور اُس کے پِلّے باہر پڑے ہوئے کیچ پر مُنہ اُوپر کئے بھَوں بھَوں کر رہے تھے۔

# ایک بیل

چر، چر، چر چوں ..... کرڑ، کرڑ، چر چوں ..... ن ـ ن ـ تیل اور گرد سے میلا چٹا پٹر باندھے دبلا، مریل سا بیل ہمیشہ سے ایک ہی طرح کے گول گول چکر لگاتا رہتا، وہ کہیں پر ذرا ٹھہرے بغیر بس ایک جانے بوجھے انداز میں آہستہ آہستہ گھومتا جاتا۔ سوکھے ہوئے چمڑے پر اس کی ساری پسلیاں اُبھری ہوئی تھیں۔ گردش کرتے کرتے اس کے کولھے کی ہڈی ایک طرف سے خطرناک طور پر نکلی ہوئی تھی اور اس کی دوسری جانب دھنسی ہوئی مگر نمایاں۔

پٹّر بندھا ہوا بیل چکّر لگاتا اور کولھو کے بھاری بھاری پتھروں پر بیٹھی ہوئی تیلن ہاتھ میں ایک لکڑی لئے مسلسل گھومے جاتی۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد، اس کے سُوکھے ہوئے ہاتھوں میں جنبش ہوتی، لیکن بیل اِن ہلکی پھُلکی ماروں کی پرواہ نہ کرتا اور، اپنے مخصوص انداز میں بغیر کوئی تبدیلی پیدا کیئے اسی طرح چلتا رہتا۔ چرچر... چرچوں"۔ اور ٹھیک ویسے ہی کھُردرے پتھّروں پر بیٹھی ہوئی تیلن کے دماغ میں بھی خیالات چکّر لگاتے ہُوئے آنکھوں میں گھومتے رہتے ۔"کتنا اچھا تھا وُہ بیچارہ بیل رات کے پچھلے پہر تک جو چلتا تو دو بجے دن تک چار سیر تیل دے دیتا تھا۔ اور پھر دوسرا پھیرا۔ سارا خرچ اُسی کے دَم سے تھا گھر، باہر، کھانا پینا تلہن، چارہ، سب ہی کچھ۔ بچارے مکھوا کا دوا دارو بھی تو اسی سے ہوا تھا۔ پر کرم کا لکھا۔ اور جو کرپا کرم میں لگا تو کہاں سے اسی کے بھرو سے ناسُکیا کا بیاہ ہوا۔ برات کو کھلا پلا کر گونا میں بازو، ہنسلی، کان کا پھول سب ہی دیا۔ اور پھر جو اتنے دنوں سے منوا کا باپ پلنگ پکڑے ہوئے ہے۔ تو بیسوں قسم کی دوا اسی کے دم سے ہوتی رہی تھی۔ اور اب تو نگوڑے کو بھرپیٹ دانہ بھی نصیب نہیں ہے۔ دوا کہاں سے ہو"اُرزرہٹ"۔ وُہ جیسے چونک جاتی مرنگھٹو، کوڑھی بیل، وُہ اُس کی پیٹھ پہ لکڑی مار کر سر کھجاتی

ہوئی بڑبڑاتی۔

روز روز وہ ایک ہی طرح سے چلتے ہوئے اس کام چور بیل سے تھک گئی تھی۔ جب وہ بیل کی آہستہ چلنے والی ٹانگوں کو دیکھتی تو جیسے اس کے سارے بدن میں آگ سی لگ جاتی "کوڑھی! دن بھر میں جو دو سیر بھی نہ پیر سکے۔ وہ بھی بیل کہلائے۔ چار کھانے والے بچے اور ایک فالج کا مارا کھوں کھوں کرتا ہوا دمہ کا مریض شوہر۔ اتنے لوگوں کا پیٹ وہ کہاں سے بھرتی۔ تلہن آگ کا مول ہو رہا تھا۔ پھر بھی وہ جیسے تیسے قرض، ادھار لیکر ساری ذمہ داریاں پوری کرتی ہی رہتی۔ لیکن وہ بیل کے قدموں کو کیسے تیز کر دے جب وہ اپنے پاس سے گاہک کو لوٹتا ہوا دیکھتی تو تلملا کر بیل کی ابھری ہوئی ہڈیوں کو پیٹتی، اس کا جی چاہتا کہ وہ اس کی پٹی سے بندھی ہوئی آنکھوں میں زور سے لکڑی گھونپ دے اور اس کے گلے کے زخموں کو رسّی سے خوب رگڑ رگڑ کر اسے کھینچتی ہوئی کسی گڑھے میں دھکیل آئے۔ اور اس کے بعد سامنے کی ٹھٹھر گرا کر وہ ڈھیروں ڈھیر سرسوں کی ایک ہی گھانی لگا کر بیل کی جگہ اپنی گردن پہ کولھو کا جوا رکھ دے۔ اتنے زور زور سے گھومتی جائے کہ اسے اپنے گھر کی ٹوٹی لگی دیواریں، سیاہ لوٹا ہوا کواڑ، کولھو، کھودی ہوئی زمین، اور پھر ٹھٹھری کے سوراخوں سے

تھوڑا تھوڑا دکھائی دیتا ہوا آسمان کچھ بھی نظر نہ آئے۔ جیسے وہ اپنی ماں کے گھر چکی پیستی ہوئی گائے جاتی تھی تو اُسے اتنا ہوش بھی نہ رہتا تھا کہ کتنے سیر پیس چکی ہے۔ بالکل اُسی طرح، وہ اب بھی لہک لہک کر وہی گیت گانا چاہتی تھی اُس نے اپنے دُبلے، لٹکتے ہوئے ہاتھوں کو دیکھا "اس کی کلائیاں کتنی بھری ہوئی تھیں جب، ان دنوں نہ تو اس کا کوئی بیٹا مرا تھا نہ بیمار شوہر کی تیمار داریاں تھیں اور نہ اس کی جان کو کھانے والے، اتنے روتے اور ٹھنٹھناتے ہوئے بچے ہی تھے۔ سکھوا کا مر جانا، منوا کے باپ کی بیماری، جوان بیٹی کا سر پہ اتنا بڑا بھار اور اس پر یہ نگوڑا بیل"۔

دُوسرے بچے تو نادان تھے۔ لیکن ماں کے دُکھ درد کی ساتھی نینا گھر کی حالت دیکھ کر کڑھتی رہتی لڑکپن سے جوانی تک اس نے کبھی چین کی گھڑیاں نہ دیکھی تھیں چوڑی اور لچھیوں سے خالی، جب وہ اپنے ڈنڈے سے ہاتھ کو دیکھتی تو اس کے دل پر ایک دھکا سا لگتا۔ لیکن اسے یہ سوچ کر تسکین ہو جاتی کہ اس نے اپنے ہاتھوں کے کڑے اپنے بیمار باپ اور مرنے والے بھائی کے لئے ہی اتارے تھے۔ بچپن کی شریر اور چنچل نینا کو جوانی کے بوجھ نے سنجیدہ اور متین بنا دیا تھا، اپنی ماں کے ساتھ اسکو اپنے آپ سے بھی شکایت

تھی۔ کہ وہ اتنی جلدی آنکھوں پر پہاڑ کیوں بن گئی۔ اس پر پابندیاں عائد ہو چکی تھیں وہ گھر سے نکلتی تو ایک مجرم کی طرح منہ چھپائے، سر جھکائے، آنکھیں چرائے، اس کے کانوں میں طرح طرح کی آوازیں گولیوں کی طرح سنسناتیں۔ مگر وہ خاموشی سے اپنے کام کئے جاتی۔ اب وہ ان باتوں کی عادی ہو چکی تھی لیکن کبھی کبھی اس کا دل چاہتا کہ ان گنڈوں کے منہ نوچ لے "غریب، بے تھاہ نینا" جیسے اس کا دل ڈوبنے لگتا۔

ایک دن پانی سے بھیگی، کیچڑ سے لت پت۔ سرسوں کا بھرا ہوا ٹوکرا اپنے سر پر لئے ہانپتی چلی آرہی تھی اور اس کے پیچھے جنسی بھوک کے مارے ہوئے کتے۔ اپنی دموں کو ہلاتے زور زور سے بھونک رہے تھے سیتل انہیں آنکھیں نکال کر ڈانٹتے ہوئے بولا "اپنے گاؤں اجت اپنے ہاتھوں بیگاڑتے شرم بھی نہیں آتی تمہیں"؟ نینا حیران تھی ایسے بھی ہوتے ہیں انسان۔ سیتل نے اس کے سر سے ٹوکرا لے لیا۔ وہ اس کے پیچھے پیچھے اپنی بھیگی ساڑی میں سمٹی ہوئی جانے لگی۔ کتنی باتیں سیتل نے اس سے راستہ میں پوچھیں مگر وہ شرمائی ہوئی آنچل کا کونا اپنے دانتوں سے دبائے خاموش رہی۔ اس دن کے بعد سے نینا محسوس کرنے لگی کہ وہ بے آسرا

نہ تھی اُسے اپنے کمزور ہاتھوں میں سہارے کیلئے ایک لاٹھی کی ضرورت تھی اور وہ اسے مل گئی تھی۔ وہ سیتل کو روزانہ کہیں نہ کہیں دیکھ ہی لیتی وہ اس سے کئی طرح کی باتیں کرتا رہتا نینا اپنے بچپن کی باتیں بڑے شوق سے سُنتی اور جب سیتل اُسے یاد دلاتا" نینا تو ہر گھڑی میرے کندھے پر سوار مجھے گھوڑا بناتی تھی بھول گئی سب! ایں"۔ تو نینا کا جی چاہتا کہ وہ اُسے بتا دے کہ اسے ایسے ہی سہارے کی تو ضرورت تھی۔ گھر کے کاموں سے تھک کر جب وہ اپنی اندھیری کوٹھڑی میں ایک پل کیلئے کمر سیدھی کرنے لگتی تو سیتل مسکراتا ہوا چہرہ اس کی آنکھوں میں گھوم جاتا۔ اس وقت اسے ساری باتیں یاد آجاتیں اور وہ اپنی کلائی کو مٹھی میں بھینچ کر کہتی "سیتل نے اجلے اجلے چاندی کے کنگنے بنا دینے کو کہا ہے اور ماں کے لئے بھی ایک اچھا سا بیل لا دے گا، پھر کتنا آرام رہے گا"۔ جب وہ اپنی ماں کو پریشانیوں میں گھری، روتے ہوئے دیکھتی تو اس کا دل چاہتا کہ وہ جلد اُسے یہ خوشخبری سُنا دے کہ سیتل ایک چمکتا ہوا بیل اُسے لا دے گا، وہ اکثر تنہائیوں میں اپنے چھوٹے چھوٹے بھائی بہنوں کو تسکین دیتی "تیرے لئے اچھے اچھے کپڑے بنا دیں گے اور ڈھیر سی مٹھائی بھی"۔ تو بچے اُس کا مُنہ چڑا کر بھاگ جاتے "دور چھٹی"۔ کنگنے۔ کپڑے، بیل، اور بہت ساری چیزیں، نینا ہر دن اپنے دل کے ویران گوشوں کو جانی کی انہی رنگین و پرکیف مگر ناقابل اعتبار اور سرسری باتوں سے آباد کئے رہتی اس کے تصور میں اس کی زندگی ہر روز نت نئی بہاریں لیکر آتی۔

نیناؔ کی ماں جب بَیل کی ہڈیوں کو بُری طرح پیٹ چکتی تو اس کا دل تھوڑی دیر کیلئے پچھتاتا ”بچارا بُرا یا بھلا، گھر چالو تو یہی ہے نا۔ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا بھی بہت ہوتا ہے۔ جب یہ نہ تھا تو ان پر کیسے کٹھن وقت گذر رہے تھے۔ یہی رام لال بنیا جو آج اس بیل کو دیکھ کے ادھار بھی دیتا ہے کیسے دیدے نکال کر کہتا تھا کس برتے پر دوں تجھے“

وہ ہر روز منوا کے باپ کو اُمید دلاتی ذرا دم لے گرمی کھلا کھلا کر ٹھیک کر دینگے“۔ ابھی تو بیل نیا تھا کیا جانے بچارہ کوھوا اور وہ گرمی، جڑی بوٹیوں کی ایک طویل فہرست اس کی ساری خصوصیت کے کیساتھ بڑی تیزی سے بتاتی جاتی۔ بچارہ منوا کا باپ جھلنگا چارپائی پر پڑا اپنے دونوں ہاتھوں سے کلیجہ تھامے ہوئے کھوں کھوں کرتا ہوا مشکل سے کہتا ” پہلے اپنے بیل کو کھلا پلا لے نیناؔ کی ماں! بس ہڈی چمڑا ہے کھالی“۔ کھانسی سے بیدم چھتوا تیلی پیلے پیلے بلغم سامنے کی دیوار پر پھینک کر زبان چاٹتے ہوئے تعریفی طور پر اپنی دھنسی ہوئی آنکھوں سے نیناؔ کی ماں کو تکتا ہوا کہتا کہ اب تک یہ اسی کا جگر تھا جو گھر باہر، لڑکے بالے سنبھالے ہوئے تھی لیکن جہاں اس نے اتنے کام کئے تھے وہاں بچارے چھتوا کی یہ انتہائی تمنا تھی کہ وہ ذرا اور ہمت دکھا کر بیل کے قرض کو بھی اُتار دے۔ مگر نیناؔ کی ماں تڑپ جاتی۔ اسی کا دل جانتا تھا کہ ایک ایک گھڑی اس پر کیسی بیتی ہے۔ تلہن کے کئی روپے اب تک اس پر چڑھ چکے تھے۔ پھر قرض کا سود الگ بڑھ رہا تھا۔ اُس نے اپنے پیٹ کی خاطر اپنی بیاہی ہوئی بیٹی کی چیز گروی

رکھی تھی۔ اگر اس کا اپنا بازو قرضے میں بک بھی جاتا تو اسے اتنی پریشانی نہ ہوتی۔ بچاری اپنے پیٹ کی بیٹی تھی جب ہی تو سسرال سے اپنا بازو چرا کر دے گئی کہ جب تیل کا دام نکلنے لگے گا تو وہ اُسے چھڑا لے گی۔ چھ مہینے بیت گئے اس روگی بیل کے دم سے ایک پیسہ کا بھی آسرا نہ تھا۔ مگر پھر بھی آئندہ کے سہارے ہر روز کتری کے بھاری بھاری پتھروں پر بیٹھی ہوئی وہ سوچتی۔ کوڑے کا دن بھی بارہ برس پر پھرتا ہے بسلیا کا بازو چھڑانے کے بعد وہ ایک اور بیل لے گی اور جب دو بیل دن بھر چلیں گے تب تو بس تیل ہی تیل ہوگا۔

"چاچی! اب چاچا کا جی کیسا ہے" وہ یکایک ایسے چونک پڑی جیسے تیل کے بھرے ہوئے کنستر ٹھوکر لگ کر بہہ رہے ہوں۔

"کون! سیتل ہے؟ آ بیٹا! کل کتنی گھڑی توں آیا تھا؟ ہم نا دیکھا تیرے یہی منوا بولا توں آکر لوٹ گیا"

"ہاں چاچی کچھ کام تھا تیرے سے" وہ کھسیانا ہو کر اِدھر اُدھر تاکنے لگا۔ سیتل سر جھکائے، رُک رُک کر باتیں کرنے لگا۔

پانی برسنے لگا تھا۔ مگر ابھی تک اس کے بعض کھیت ایسے ہی بیکار پڑے تھے۔ دنیا اتنی مہنگی ہو رہی تھی اور اس پر ٹھیک جتائی کے دنوں اس کا ایک بیل بُری طرح بیمار پڑا تھا۔ اب ایک بیل سے کیا ہو، جب دوسرا کہیں ملے تب نا۔ بس یہی دو چار دنوں کی ضرورت تھی۔

نینا کی ماں اس کی باتوں کا مطلب سمجھ کر کہنے لگی۔ اس سے بھی کوئی بہانا تھا۔ لیکن ایسا کوڑھی نکما بیل بھی دنیا میں نہ ہوگا جو پیر چلانے کا نام تک نہ جانے اور پھر بچارا چلے بھی کیا بارہ روپے کا بیل بھی کہیں کولھو میں چلتا ہے؟

"اچھا لادے ہم چالو کر لادیں" نینا کی ماں کا جی چاہا کہ وہ زور سے کہدے کہ وہ ہم نہیں دیں گے"۔ لیکن اُسے یاد آگیا ایسے ہی۔ رام داس کو جو اُس نے بیل نہیں دیا تھا تو اس کے سراپ سے وہ بچارا ایک مہینہ بھی کولھو میں نہ جتا ہوگا کہ مر گیا، وہ ڈری اگر وہ آج بھی نہ دے اور پھر کہیں یہ زندگی کا آخری سہارا بھی ختم ہوگیا تو کیا ہوگا؟

جب سیتل بیل کھول کر لے جانے لگا تو نینا کی ماں نے پکار کر کہا ذرا اسے کھلا پلا لینا سیتل، سبیر سے بھوکا ہے" مگر یہی کہہ دینے سے اس کے دل کو تسلی نہ ہوئی اس کا جی اندر سے گھبرا رہا تھا، نہ جانے سیتل کے کتنے کھیت آج جوتے گا بچارا مرتو رہا ہے۔ وہ اس بُرے شگون کے خیال سے کانپ گئی اس نے سوچا اب ہریالی ہو رہی ہے میرا بیل کھا کھا کر مٹا ہو جائے گا۔

سورج ڈوبے، سیتل کے چھوٹے بھائی چندو نے بیل لاکر باندھ دیا۔ آج پہلی بار نینا کی ماں اس کے لئے بیچین رہی تھی۔ اس نے بیل

کی آنکھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پیار سے کہا "کہاں نیوتا کھائے گیا تھا ہیرا؟ کیسا سُونا سُونا گھر لگتا تھا تیرے بنا"۔ مُنہ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اس کی انگلیوں میں بھین لگ گئے وہ چونک پڑی، بیل لڑکھڑا کر گرا وہ باری باری اس کے پیروں کو اٹھا کر دیکھنے لگی کہیں کانٹا نہ چُبھ گیا ہو۔ بیل ہانپتا ہوا اپنے پاؤں پھیلا کر تڑپنے لگا۔ اُس کے منہ سے اُجلے اُجلے جھاگ نکل رہے تھے۔ اس کی گردن کا زخم خون سے لت پت ہو رہا تھا اور انتہائی تکلیف سے اُس کی آنکھیں کھُل کھُل کر بند ہوئی جا رہی تھیں، نینا کی ماں اپنی اُمیدوں کا آخری دیا بجھتے ہوئے نہ دیکھ سکی، وہ روتی ہوئی ستیل کے گھر گئی وہ گھر پر نہ تھا اُس نے چیخ کر سارے محلے میں فریاد کی وہ ذبح کئے ہوئے بکرے کی طرح تڑپ رہی تھی اُس کی آنکھیں نکلی پڑتی تھیں۔ گلے کی تمام رگیں تن گئی تھیں۔ اور اپنے بدن کا سارا زور لگا کر گالیاں دے رہی تھی "ہنڈی کاٹا، حرمجادہ، تیرا بھی لہاس نکلے گا رے! گریب ڈکھیا کو ستا کے تو کہاں جا گا؟" وہ مسلسل گالی اور کوسنوں سے اپنے دل کی بھڑاس نکال رہی تھی۔

چندو کی تیز زبان شعلے برسانے لگی۔ "جبان سنبھال کے بول، نہیں تو ٹھیک کر دیں گے"۔ وہ کہنے لگا شاید اس پوری بستی میں نینا کی ماں جیسی

بھی کوئی قصائن نہ ہوگی جس نے روگی بیل کو کولھو میں جوت جوت کے آخر جان ہی لے لی اس کی۔ اور اب شرم کرنے کی جگہ اپنا الزام دوسرے کے سر تھوپ رہی ہے وہ حلق پھاڑ پھاڑ کر بولا "بھلا ایک دن کی محنت سے بھی کہیں بیل مر سکتا تھا۔ نینا کی ماں تڑپ گئی اور تلملا کر بولی "تارے چندوا ہمرا بیل اچھا تھا توں ہی مار ڈالے"۔ وہ بین کر کر کے رونے لگی، چراغ بتی کے وقت اپنے گھر پہ رونا دھونا چندو کیسے گوارا کر سکتا تھا، وہ اُسے دھمکاتا ہوا پکڑے پکڑے گلی کے نکڑ تک چھوڑ آیا جب وہ گھر پہنچی تو بیل مر چکا تھا وہ زور زور سے سینہ پیٹ کے رونے لگی۔ آدمیوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگ گئے اس نے دور سے میتل کو دیکھا وہ لڑکھڑاتی ہوئی وہاں تک آئی اس کی آواز بیٹھ چکی تھی۔ اس نے اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اس کے پیر پکڑ لئے وہ روتے ہوئے بولی "تیرا کیا تھا میتل"۔ میتل منہ میں انگلی دبائے چپ کھڑا تھا۔ اس کے دماغ میں ایک ہل چل سی مچی ہوئی تھی اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا" نینا کا گھر اس نے اپنے ہاتھوں کیدل اجاڑ دیا، کیسی ساعت میں وہ بیل لے کر چلا تھا، زمین بلا سے پڑی رہتی ایسے ہی، بنجر کھیت ہرا ہو گا، پودے لہلہائیں گے کھیتی ہوگی۔ لیکن نینا کا دل اس نے مٹی کے ڈھیلوں کی طرح ہمیشہ کے لئے چور چور کر دیا۔ اور اب

اس کے باپ کو کیا پڑی تھی جو اس کی دل وہی کے لئے اپنا بیل دے دیتا۔ اور وہ بیچارہ اگر چاہے بھی تو کیا کر سکتا تھا وہ بھی بیلوں کے سہارے اُسے بھی اتنی بڑی زندگی کھینچنی تھی، جس میں سے ایک بیل تو بیمار ہی تھا، اُسے تو خود ہی دوسروں کا آسرا ہوتا۔ سیتل کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ دُنیا کے حسین سے حسین بیل نیناؔ کے قدموں پہ لاکر ڈال دے۔ اُس نے ماں سے لگی سسکتی ہوئی نیناؔ کو دیکھا اور اس کی آنکھوں میں مجبوری و حسرت کے آنسو بھر گئے۔ نیناؔ کی مایوس نگاہیں، سیتلؔ کے چہرے پر جم گئیں۔ ہر طرف اندھیرا چھا گیا تھا روح اور جسم تاریکیوں میں ڈوب چکے تھے۔ تمنائیں گھُٹ رہی تھیں۔ سہارے مٹ رہے تھے اور بے آس سسکیوں میں کبھی کبھی زور سے اُمیدیں ہچکیاں لے کر دم توڑ رہی تھیں۔ نیناؔ اپنے آنسوؤں کے قطروں میں چوڑیاں، کنگنے اور چمکتے ہوئے چکنے چکنے بیل، اُبھر اُبھر کر مٹتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔

# بوڑھا مدرّس

کتنے روشن دن بیتے اور کتنی چاندنی راتیں گذر گئیں۔ کتنی ترقیاں ہوئیں اور کتنے علوم و فنون کے چہرے سے نقاب ہٹایا گیا۔ غرض کیا کیا ہوا مگر غریب بوڑھا مدرّس اپنی افسردہ دنیا میں خاموش، بے حس و حرکت پڑا رہا۔ وہ ایک دیہات کے چھوٹے سے گرل سکول کا مدرّس تھا۔ اس کے زیرِ تعلیم دس بارہ لڑکیاں تھیں جو کبھی تو پڑھنے آجاتیں اور کبھی اپنے گھر کے کام دھندوں میں ایسی پھنس جاتیں کہ مکتب کا خیال تک نہ آتا۔ مگر بوڑھا مدرّس ہمیشہ وقت سے پہلے ہی مکتب میں بیٹھا سوچتا رہتا وہ سبق پڑھاتا، آموختہ یاد کراتا تختی

لکھاتا۔ مگر ہر وقت کسی فکر میں کھویا سا رہتا۔ ہمیشہ کوئی خیال اُسے گھلائے دیتا۔ وہ سوچتا رہتا "آج گھر میں کچھ بھی نہیں۔ ننھے ننھے بچے کیا کھائیں گے؟ سردی کا زمانہ ہے۔ معصوم بچے کب تک ایک ہی پھٹی رضائی میں گھسے دن کاٹیں گے"؟ پھر وہ ایک خاموش آہ بھر کر آہستہ سے چھڑی زمین پر پٹکتا اور ایک مری ہوئی آواز اُس کے لبوں سے نکلتی "لڑکیو! زور سے پڑھو!"

بوڑھے مدرّس کی تنخواہ صرف بارہ روپے تھی۔ بارہ روپے اور آٹھ بچے ایک بیوی اور خود۔ بھلا دس آدمیوں کے لئے یہ بارہ روپے کیا حقیقت رکھتے تھے! یہ ضرور ہے کہ جس وقت بوڑھے مدرس کے ہاتھ میں اُس کی تنخواہ آتی تو وقتی مسّرت کی ایک لہر اس کے رگ و پے میں دوڑ جاتی۔ مگر پھر جب لوگ اُس سے اپنا قرض لینے کو آتے تو وہ حسرت بھری نظروں سے اُن کے منہ تکتا۔ آدھی سے زیادہ محنت کی کمائی دوسرے لوگ لڑ جھگڑ کر لے جاتے اس کے بعد پھر وہی فکر، وہی تردد، وہی فاقہ اور وہی قرض۔

جاڑا آتا گرمی آتی برسات گذر جاتی۔ مگر بچارے مدرس کے ننھے بچّے ہمیشہ پھٹی ہوئی گدڑیوں ہی میں ملبوس رہتے۔ عید، بقرعید اُن بچارں کے لئے اس دنیا میں تھی ہی نہیں اور غریب بوڑھا مدرس! آہ اُس کی

جان تو ایک عذاب میں تھی۔ مکتب سے آ کر کبھی تو اسے کچھ کھانے کو مل جاتا۔ اور کبھی نمک چاٹ کر ہی پانی پی لیتا۔ پھر اپنی تسبیح تیزی سے گھماتا اور زیر لب گنگناتا ہوا مسجد کی طرف چلا جاتا وہاں سے رات گئے آتا اور خاموشی کے ساتھ ٹوٹی ہوئی ایک پلنگڑی پر سو جاتا۔ اسی طرح اس کی قابلِ رحم زندگی گذر رہی تھی۔

سال میں ایک بار مکتب کے معائینے کے لئے اسکول انسپکٹرس آیا کرتی تھی بوڑھا مدرس اُس کے آنے کی خبر سُنکر سہم جاتا تھا۔ وہ پرانی وضع کا مدرس تھا جس کے پاس ٹریننگ کی سند نہیں تھی۔ بستی میں بھی تعلیم کا کچھ ایسا چرچا نہ تھا پھر اگر لڑکیاں وقت پر حاضر نہ ہوتیں تو اس میں اُس بچارے کا کیا قصور؟ اگر وہ انہیں مارتا یا ڈانٹتا تو لڑکیاں یہ کہہ کر اپنا نام کٹوا لیتیں۔ کہ اُنہیں اپنے گھروں میں بہت سے کام رہتے ہیں اور پھر پڑھنا بھی تو کچھ ضروری نہیں، بوڑھا مدرس سکول انسپکٹرس کی آمد سُن کر کہلوا بھیجتا کہ وہ بیمار ہے۔ اور پھر دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ اپنی پھٹی ہوئی چادر میں لپٹا ہوا دعا کرتا "معبود اُسے میری خبر نہ ہو" آخر یہ بہانا بھی کب تک چلتا؟ دوسرے سال وہ معائنے کے وقت بیٹھا رہا۔ اس کے سامنے سکول کے فائل دھڑا دھڑ غصّے میں پٹکے جا رہے تھے۔ منت سماجت سے بلائی ہوئی لڑکیاں اپنا سارا سبق بھلائے ہوئے خاموش بیٹھی تھیں۔ اور بچارا

ہے بس ....... آہ وہ ایک طرف خاموش بے حس و حرکت بیٹھا تھا سکول انسپکٹرس نے غصے میں دانت پیستے ہوئے کہا "یہ گرل سکول توڑ دیا جائے گا۔ اور تم بوڑھے میاں اپنے ہاتھ میں صرف چھڑی لئے گھر میں اونگھتے رہ گئے" مگر بستی کے لوگوں نے کہا "آہ غریب بوڑھا مر جائے گا۔ یہی ایک سہارا اس کے اور اُس کے سارے بچوں کی زندگی کا ہے" سکول انسپکٹرس نے گھورتے ہوئے کہا "بس ایک سال کا وقت دیتی ہوں تم اپنی کاہلی دور کر لو"۔

بوڑھے مدرس کے لڑکے کو لوگ دیکھ دیکھ کر کہہ رہے تھے "اسلم اب بڑا ہو گیا ہے۔ اب تمہاری مصیبتیں دور ہونے کے دن آگئے باپ اور بیٹے کی کمائی سے دن پھر جائیں گے"

اسلم نے غربت اور فاقہ کی گود میں جنم لیا تھا۔ اُس نے کبھی اچھا کھانا نہ کھایا تھا۔ غریب والدین نے اپنا اور دوسرے بچوں کا پیٹ کاٹ کاٹ کر بڑی مشکلات سے اُسے مڈل تک پڑھایا تھا۔ اسلم اب جوان تھا۔ بچپن تو گذر گیا۔ مگر جوانی کی نئی نئی امنگوں کو کون روکے؟ اسلم بھی دوسروں کو دیکھ کر شباب کی رنگینیوں سے لطف اندوز ہونے کا خواہاں تھا۔ مگر اُس میں اور دوسرے لوگوں میں ایک بہت بڑا فرق تھا ـــــ وہی فرق جو امارت و غربت میں

ہوتا ہے!

اب اسے کھدر کی قمیص بری لگتی تھی۔ وہ بھی دھاریوں والی قمیضوں کا متمنی تھا۔ مگر وہ اپنے دل کو سمجھاتا اپنی آرزوؤں کو روکتا اور ایک افسردہ آہ میں اپنی ساری خواہشوں کو تھوڑی دیر کے لئے دُور کر دیتا۔

اسلم نے ہوش سنبھالتے ہی گھر کی غربت، فاقہ، ضرورت اور اپنی تمناؤں کی خلش کو محسوس کیا وہ پٹنہ بجلی گھر میں کام سیکھنے گیا۔ اُس نے بڑی محنت کی۔ انجینئر نے اُس کے کام سے خوش ہو کر اسے جلد نوکری دینے کا وعدہ کر لیا۔ اسی اثنا میں بدقسمتی سے ایک دن انجن صاف کرتے ہوئے اس کا ہاتھ بری طرح مجروح ہو گیا۔ تھوڑے دنوں کی چھٹی لے کر وہ گھر چلا آیا۔ علاج معالجہ پر بھی زخموں نے کافی طول کھینچا۔ بیچارے مدرس نے اسلم کو جلد نوکری مل جانے کی اُمید سے علاج معالجہ پر قرض لے کر خرچ کیا۔ اسلم کے زخمی ہاتھوں کو وہ اپنے کانپتے ہوئے ہاتھ میں لے کر دیر تک آہستہ آہستہ دعائیں کرتا جیسے تو ایسا معلوم ہوتا جیسے اسلم کبھی اچھا ہوگا ہی نہیں۔ وہ نیم کی پتیاں لا کر گرم کرتا اور اپنے ہی ہاتھوں سے اسلم کا زخم دھوتا اس خیال سے کہ شائد بوڑھے باپ کے تھرتھراتے ہوئے ہاتھوں سے دھویا ہُوا زخم جلد ہی بھر جائے گا۔

...... مگر ...... بوڑھا مدرس کبھی سوچتا ...... اگر اسلم

کا زخم مندمل نہ ہوا اور حرارت بڑھ کر زہریلا بخار ہو گیا تو ....
.... تو پھر! وہ کیا کرے گا؟ کتنی مصیبتوں سے اُس نے اس پودے کو اپنے خونِ جگر سے سینچ سینچ کر درخت بنایا تھا۔ اور اب ........ کیا وہ اتنی آسانی سے اسے جڑ سے گر جانے دے گا .... اور اُس کی پھیلنے والی شاخوں کے گھنے پُرسکون سائے کیا اُسے تسکین نہیں پہنچائیں گے"؟ بوڑھا مدرس ان حوصلہ فرسا خیالات کو اپنے دل سے دور کرنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے اسلم کے چہرے کو بیکسانہ نگاہوں سے دیکھنے لگتا ......

آخر تین ماہ کے بعد اسلم اچھا ہو کر واپس پٹنہ گیا۔ مگر وہاں جا کر دیکھا کہ پہلے انجینئر کی تبدیلی ہو چکی تھی۔ اور اس کی جگہ ایک خشک چہرے والا مدراسی انجینئر اُس سے بولنا بھی پسند نہیں کرتا تھا ......!

وہ افسردہ ہو کر گھر پہنچا۔ بوڑھا مدرس اسلم کے مغموم چہرے کو دیکھ کر دھک سے رہ گیا اور پھر حسبِ معمول اسلم فاقہ سے نڈھال اور بے سمجھ بھائی بہنوں کی چیخ پکار بے چین ہو کر سنتا رہتا ......!

رمضان آیا اور بڑے دھوم دھام سے آیا ... مگر ان غریبوں کے لئے کونسی نئی بات ہوئی اِن کے یہاں تو ہمیشہ رمضان رہتا تھا۔

بوڑھا مدرس، اسلم، اور اُس کے سارے گھر والے روزہ رکھتے۔ مگر افطار کبھی تو روکھی روٹیوں سے ہوتا اور کبھی بھُنے ہوئے بونٹ سے۔

بجلی گھر میں کام کرنے سے الاؤنس کے طور پر اسلم کو دس روپے مل جاتے تھے۔ اور اسی طرح اُسے اچھی خوراک مہیّا ہو جاتی تھی۔ مگر یہاں کی سوکھی روٹیاں اسے پسند نہ آتیں وہ دو ایک لقمے کھا کر اُٹھ جاتا اور بوڑھا مدرس محبت سے کہتا "بیٹا تھوڑا اور کھا لو کھانے سے بدن میں کچھ تو طاقت رہے گی"۔ اپنی صحت کا خیال کرو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ کمزور ہو کر کسی کام کے قابل نہ رہو"۔

بچارا مدرس اونگھتا ہوا ہمیشہ اسلم کی نوکری کی بابت سوچتا رہتا۔ وہ تصوّرات کی دُنیا میں کبھی تو اسلم کو تیس پینتیس روپے کا ٹیچر محسوس کرتا اور کبھی اُسے جمعدار بناتا غرض بوڑھے مدرس کے تخیلات کی دُنیا شاداب تھی۔ لیکن کبھی کبھی غریب مدرس ان سب نوکریوں سے مایوس ہو کر کہتا۔ "موٹر کے ڈرائیور بھی تو خوب کما لیتے ہیں"۔

افطار اور سحری ان غریبوں کے یہاں کیا ہو سکتی تھی۔ اور لوگ تو کچھ کھا لیتے مگر بے چارہ اسلم ہمیشہ ہی بھوکا رہتا اس خیال سے کہ کہیں کھانا گھٹ نہ جائے!

ایک دن بوڑھے مدرس کے یہاں کھانے کو کچھ بھی نہ تھا۔ پانی کے

دو گھونٹ سے روزہ کھول کر سب کوٹھڑی میں خاموش بیٹھے تھے غربت کی تاریکیاں ہر طرف چھائی تھیں۔ ایک طرف ٹوٹی ہوئی پلنگری پر بیٹھا بوڑھا مدرّس تسبیح کے دانوں کو گھماتا ہوا اپنی اور دوسروں کی بھوک کے تکلیف دِہ خیال کو دل سے بھلا رہا تھا۔ دوسری طرف اس کی چھوٹی بچی امرود سامنے پھینک کر روٹی کے لئے رو رہی تھی۔ دوسرا بچہ دیوار سے لگا ہوا چیخ رہا تھا۔ اسلم بھی ایک طرف اُداس بیٹھا خون کے آنسو بہا رہا تھا۔ آخر اُس سے نہ رہا گیا۔ اُس نے اپنے پھٹے ہوئے دامن سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا "اماں تم چولھا جلاؤ میں کچھ ادھار لے آتا ہوں"۔ ماں نے بیٹے کو حسرت بھری نظروں سے تکتے ہوئے کہا۔ "کہاں سے لاؤ گے بیٹا، اب تو کوئی بھی نہیں دیتا!"

"میں کوشش کرتا ہوں تم آگ جلاؤ اماں" اسلم یہ کہہ کر تیزی سے بازار کی طرف چلا گیا۔ اُسے دُور ہی سے آتا ہوا دیکھ کر بنئے نے کہا "اسی طرف لوٹ جاؤ نہیں تو کپڑے بیچ کر اپنی چیزوں کی قیمت لے لوں گا"!

اسلم آنسو پونچھتا ہوا بولا "بھائی ابا کی تنخواہ ملتے ہی سب سے پہلے تمہیں دوں گا۔ آج رحم کرو"۔ بنئے نے ڈانٹتے ہوئے کہا۔ "کیا ملے گا میاں۔ دس کی جگہ پانچ دو گے پھر بھی میرے پانچ باقی ہی رہیں گے، اور اُس پر آج پھر رحم کروں؟ تم پر رحم اور خود پر قہر کروں نا؟ جاؤ میں ہرگز نہ دونگا۔

"مگر سنو" اسلم نے گڑگڑاتے ہوئے کہا" روزہ رکھ کر ہم سارے لوگ اس وقت تک بھوکے ہیں خیر ہمیں جانے دو مگر جانتے ہو میرے ننھے ننھے بھائی بہن بھوک سے تڑپ رہے ہیں جب مجھ سے ان کا تڑپنا نہ دیکھا گیا تو میں ادھر کچھ لینے آ گیا۔ بھائی خدا کے لیئے اس وقت کچھ دے دو۔ میرے گھر میں چولھا تک نہ جلا تھا۔ ابھی جلوا کر آیا ہوں بچے آگ جلتی دیکھ کر خوش ہو رہے ہیں۔ بھائی آج دے دو پھر کبھی مت دینا" بنئے نے ہنستے ہوئے دوسرے لوگوں سے کہا :" سنتے ہو بھائی یہ گھر میں چولہا جلوا کر آئے ہیں کہ میں جنس لینے جاتا ہوں۔ سمجھے اس طرح جیسے اپنے بوروں سے کوئی چاول دال نکالتا ہو!" دوسرے لوگ ہنس دیئے اور قہقہہ مارتے ہوئے بولے" میاں اسلم! آخر یہ قرض کی ہانڈی کب تک پکے گی ؟ روز روز کا ادھار کون تمہیں دے گا ؟" اسلم سر جھکائے آہستہ سے بولا" بھائی للّٰلہ آج پھر دے دو پھر میں کبھی تمہارے یہاں نہیں آؤں گا ؟ بس یہی آخری بار دے دو" مگر بنئے نے ایک نہ سُنی، غریب اسلم خاموش آنسو بہاتا ہؤا آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا گھر میں داخل ہؤا۔ دیکھا تو چولہے کی آگ بجھ چکی ہے اور دونوں ننھے بھائی بہن چولھے کے پاس ماں سے لگے ہوئے اونگھ رہے ہیں!

دوسرے دن اسلم سو کر اٹھا تو پھر بچوں کی وہی چیخ و پکار تھی۔ وہ

اپنے چھوٹے بھائی اور بہنوں کو لے کر صحن میں امرود کے درخت کے پاس آیا اور کچھ کچے پکے امرود توڑ کر انہیں دیئے۔ گھر کا حال وہی تھا۔ چولھے میں راکھ پڑی ہوئی تھی۔ اور لکڑیاں ایک کونے میں رکھی تھیں۔ جمعہ کا دن تھا اسلئے اسلم نے اپنے کپڑے دھوئے اور امرود کے درخت پر سوکھنے کے لئے پھیلا دیئے۔ گھر میں بچوں کے ہوتے ہوئے بھی آج خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ اسلم کی ماں افسردہ حال سی گھڑا اٹھائے قریب دوسرے گھر سے پانی لانے جا رہی تھی۔ اسلم نے آہستہ سے کہا "اللہ غربت میں شرافت کا نباہنا کتنا مشکل ہے" اُس نے دیکھا کہ وقت جا رہا ہے اس لئے جلدی سے پھٹی ہوئی لنگی کاندھے پر ڈال کر صابن ہاتھ میں لئے سوَن کی طرف نہانے چلا گیا۔ یہاں آ کر اُس نے دیکھا کہ اُس کا باپ اور اُس کا چھوٹا بھائی بھی موجود ہے۔ سوَن کے کنارے کافی لوگوں کا مجمع تھا، تمام نہا رہے تھے۔ اسلم اور اس کے ساتھیوں نے یہ صلاح کی کہ تیر کر اُس پار جائیں اور وہیں نہائیں۔ بوڑھے باپ نے بیٹے کو دیکھا۔ اور بیٹے نے باپ کو۔ اسلم تھوڑی دیر ٹھہر گیا۔ لیکن جیسے ہی بوڑھا مدرس دوسری طرف متوجہ ہوا اسلم اور اُس کے ساتھی سون میں کود کر تیرنے لگے ........... وہ اور اُس کے ساتھی اُس پار کے گھاٹ پہ نہا رہے تھے۔ اور بوڑھا مدرس تھوڑے سے پانی میں کانپتا ہوا

ایک کنارے پر نہار رہا تھا۔ اسلم اور اُس کے ساتھی تیر کر واپس آ رہے تھے۔ کہ اسلم اپنے ساتھیوں سے بچھڑ کر اتھاہ کی طرف غلطی سے چلا گیا۔ ندی کا بہاؤ زوروں پر تھا۔ غریب اسلم سنبھل نہ سکا۔ اُس نے ڈوبتے ہوئے اپنا ہاتھ مدد کے لئے اوپر اٹھایا۔ لوگ حیرت زدہ رہ گئے۔ ملاح کیوں غریبوں کی خاطر اپنی جان کو خطرے میں ڈالتے؟ آخر لوگوں کی چیخ پکار سے ایک چھوٹی کشتی بچارے اسلم کو بچانے کے لئے گئی۔ جیسے ہی کشتی وہاں پہنچی کہ اسلم ایک بار پھر اُبھرا۔ ایک آدمی نے جلدی سے اُس کے سر کے بالوں کو پکڑ لیا۔ مگر بال ٹوٹ کر اس کے ہاتھ میں رہ گئے۔ اور بچارا اسلم پھر نہ ابھرا۔ لوگوں نے ملاحوں سے سُون میں جال ڈلوایا مگر بے سود، ایک طرف بوڑھا مدرس حیرت زدہ کھڑا تھا۔ اُس کے مُنہ سے صرف اتنا نکل سکا "ہائے اسلم" اور پھر وُہ بھی تماشا دیکھنے لگا۔ جال دوبارہ ندی میں ڈالا گیا۔ مگر لاحاصل۔ تیر کر لوگ اس جگہ پہنچے۔ مگر فضول، بچارے اسلم کا پتہ نہ چلا۔ سب لوگ مایوس ہو کر کنارے پر کھڑے تھے۔ ملاحوں نے جال نکال کر کنارے پر ڈال دیا۔ جال سے پانی کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ سُون کی بیقرار موجوں میں اب سکون تھا۔

سطحِ آب پر کچھ بلبلے ابھر اور کچھ مٹ رہے تھے۔ ہوا کی چھیڑ سے

ننھی لہریں ایک دوسرے سے مل مل کر فنا ہو رہی تھیں اور بہتے ہوئے گلے سڑے پتے جھاگ میں لپٹے ہوئے ساحل سے لگ رہے تھے اُفق میں ڈوبتے ہوئے آفتاب کی خونی شعاعیں سون کی لہروں کو شہابی رنگ سے شعلہ ناک بنا رہی تھیں۔ ہر طرف ایک گہرا سکوت طاری تھا۔ بوڑھا مدرس یکایک گھبرا کر بولا اُس کی آواز آہستہ اور گلوگیر تھی۔ "خدا کی مصلحت! میں کیسے کفن دفن کا سامان کر سکتا۔"

# تین ستارے

بہت دن ہوئے اُس نے ایک عجیب سا خواب دیکھا تھا، جب بھی اُسے اپنا خواب یاد آتا وہ پریشان ہو جاتی۔ وہ خوف کی کپکپاہٹ سے اس کا دل لرز اٹھتا، "آسمان پر قریب ہی قریب اُس نے تین ستاروں کو چمکتے ہوئے دیکھا تھا، اُن کی سفید یاسمینی کرنیں رفتہ رفتہ گہرے پیلے رنگ سے بدلتی ہوئی سُرخ انگاروں کی طرح دہکنے لگیں، ساری کائنات ستاروں کی روشنی سے جگمگا رہی تھی مگر اُس نے دیکھا کہ ستارے لڑکھڑانے لگے اور ان کی تابندہ کرنیں شمع کی بجھتی ہوئی لَو کی طرح بھڑکنے

لگیں، وُہ آہستہ آہستہ بُجھنے لگے۔ تینوں ستارے جیسے سسک سسک کر دم توڑ رہے تھے اور آخر بڑھتے ہوئے اندھیرے میں ان کی مٹتی ہوئی ضیاء بھی ڈوب کر رہ گئی جب بھی سلّی آسمان پر ایک قطار میں تین ستاروں کو چمکتے ہوئے دیکھتی۔ اس کا جی گھبرانے لگتا، بچپن سے اُس کی عادت ہمیشہ، ہر گھڑی سوچتے رہنے کی تھی اسی لئے اب تک وُہ اپنا خواب بُھلا نہ سکتی تھی۔

جب ایک طرح سے سوچتے سوچتے اس کا جی اُکتا گیا تو اُس نے آنکھیں کھولیں اور یہ محسوس کیا کہ دُنیا خیالوں سے کہیں زیادہ حسین اور روشن ہے آسمان، زمین، ہوا، طوفان، بجلی اور جھوم جھوم کے چھانے والے بادلوں میں اسے خوشی کا احساس ہونے لگا۔ درختوں کا پتہ پتہ اس کی روح سے سرگوشیاں کرنے لگا، ساری دُنیا اسے ایک نئی اور پہلی بار دیکھی جانے والی حقیقت معلوم ہوئی جیسے وُہ ابھی ابھی نیند سے چونکی ہو، وُہ سارے جلووں کو اپنی آنکھوں میں جذب کر لینا چاہتی تھی۔ مگر یکایک اس کی رُوح میں پھر خمار آگیں انگڑائیاں تیرنے لگیں۔ ایک عجیب اور انوکھا سرور اس کی رگ رگ میں سماتا جا رہا تھا وُہ اپنی آنکھیں بند کئے پھر ایک خواب دیکھنے کی آرزومند تھی، پہلے جیسے بہکے ہوئے منتشر خیالوں کے خواب نہیں۔ ہارلی کی نگاہیں سلّی کی روح کو ایک نیا

روشن اور پُر سرور خواب دکھاتی ہوئی اس کی آنکھوں کو تھپک رہی تھیں، اس نے ہارلی کو دیکھا اور اپنے دل کی کشتی محبت کے طوفان میں بے پتوار چھوڑ دی، کبھی تو موجیں اسے ساحل سے لگا ہی دیں گی اور زندگی کی لہروں کو کسی نہ کسی کنارے سے لگنا ہی تھا، دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور محسوس کیا، نگاہیں نگاہوں سے ملیں اور ان کی روحیں دل کی پُر کیف دھڑکنوں کے جھولے میں ایک شیریں خواب دیکھنے لگیں، کبھی کبھی شرمیلی نظروں کا تصادم ہو جاتا، لبوں پر حجاب آسا تبسم کی چند کرنیں پھیل جاتیں اور آنکھوں میں ہلکی ہلکی محبوب شرارتیں رقص کرنے لگتیں، ستی خواب دیکھتی رہی سنہرے روپہلے دھندلے اور موہوم خواب، وہ ہارلی کو دیکھنے سے پہلے بھی اپنی زندگی میں بہت سے خواب دیکھ چکی تھی، اب وہ ماضی اور حال کے خوابوں کے درمیان ایک تیسرا خواب دیکھ رہی تھی۔ مگر جب وہ جاگی تو ہارلی اس کے دل میں چھپ کر اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو چکا تھا

ستی کی زندگی کے ویرانوں میں مضطرب اور پریشان خواب چھاتے گئے۔ اس کی نگاہوں کو بس دو چیزیں عزیز تھیں، اُمید کی بجھتی ہوئی چنگاریوں سے دل کے ایوانوں میں چراغاں کرنا اور بچوں کے گھروندوں کی طرح بار بار اپنی خوشی اپنی زندگی اور اپنے مقصد حیات کے گھروندے بنا بنا کر مٹاتے

رہنما ——

ایک طویل مدت کے بعد شام کے دھندلکے اور برستے ہوئے پانی میں ستلی نے اچانک ہارلی کو دیکھا وہ اس کے لبوں پر لہراتے ہوئے تبسم اور اپنی پہچانی ہوئی نگاہوں میں مچلتی ہوئی محبوب شوخیوں کو خاموشی سے دیکھتی رہی۔ وہ یک بیک اتنے شدید جذبوں سے گھبرا اٹھی تھی، وہ کچھ بھی نہ بول سکی، اس کی خواب آلود نگاہیں تمنائے منتظر بن کر ہارلی کو تکتی رہیں۔ اندھیرا چھا گیا تھا۔ ستلی نے بجلی کی روشنی جلائی، پہلی بار اس کی نظر ہارلی کی خاکی وردی پر گئی۔ اس کے چہرے پر فوجی وقار اور پرسکون طمانیت چھا رہی تھی۔ ستلی نے حیرت سے ہارلی کو دیکھا اور خوف کی ایک جھرجھری سے کانپ اٹھی مگر یکایک اس کی آنکھیں فخر و مسرت سے چھلک پڑیں، زندگی کی اہم بساط اس کے سامنے بچھ چکی تھی۔ چال اب اس کے اپنے ہاتھ میں تھی اور وہ جانتی تھی کہ کون کون سے مہرے چل کر وہ زندگی کی بازی جیت سکتی ہے۔ زندگی اور اصولِ حیات اور جنگ، وہ ہارلی کی بہت سی حیرت انگیز عجیب عجیب سی باتیں سنتی رہی اس نے افسانے اور ناولوں میں بڑے شوق سے ان باتوں کو پڑھا اور ان کی ریس کرنی چاہی تھی۔ مگر اسے ذرا بھی خیال نہ تھا کہ اس کی اپنی زندگی بھی اسی موڑ پر سے گزرے گی۔ فوجی زندگی میں ہارلی کی وہ پہلی سی جھجک باقی نہ رہی تھی۔ ستلی کے دل میں ایک خلش سی اٹھی کہ اس کا

محبوب ہارلی اب بدل چکا ہے۔ ہارلی کی عزیز آنکھوں کی وہ مسکراہٹ جو اس کی زندگی کے اندھیرے کی روشنی تھی اب اس کی نگاہوں سے معدوم ہوئی جارہی تھی۔ جھجکتی ہوئی نظروں سے سلی نے ہارلی کو دیکھا وہ اس کی شکرگذار تھی کہ اب تک ہارلی نے پہلی باتوں کو یاد رکھا تھا اور اس سے ملنے کے لئے آگیا تھا۔

تبسم کی وہی پہلی سی کھوئی ہوئی لہر ہارلی کی آنکھوں میں رقص کرنے لگی۔ سلی کی نظروں سے بچا کر اپنے شانوں پر لگے ہوئے اعزازیہ نشانوں کو اس نے چپکے سے اپنی جیب میں چھپاتے ہوئے کہا "سلی کے لئے ہارلی کبھی نہ بدل سکے گا۔" سلی ہارلی کو کچھ چھپاتے ہوئے دیکھ چکی تھی۔ اس کی نگاہیں اس کی جیب میں تھوڑے تھوڑے سے نظر آتے ہوئے بھورے سیاہ اور سفید رنگوں کو دیکھ رہی تھیں وہ خاموش نہ رہ سکی اور آخر بہت اصرار پر اس نے ہارلی سے انہیں لے ہی لیا۔ جب پُرشوق نظروں سے بجلی کی تیز روشنی میں وہ انہیں جھک کر دیکھنے لگی تو اس کا دل زور زور سے دھڑکتا ہوا جیسے ڈوبنے لگا۔ اس کے ہاتھ میں خاکی ٹکڑوں پہ ایک قطار میں تین ستارے چمک رہے تھے، وہ لرز اُٹھی اور اس کے جسم میں رعشہ سا پیدا ہو گیا۔ اپنے زمانے کے بعد اچانک اُسے اپنا خواب یاد آیا، اس کے خشک لبوں پہ کانپتی ہوئی آواز تھرائی "ہارلی یہ تمہیں تین ستاروں والے نشان کیوں ملے؟"

وہ ذرا جھجکا "یہی نشان کیپٹن کا ہوتا ہے سِتی" ——

ہارلی کے چلے جانے کے بعد وہ دیر تک اپنے کمرے میں اکیلی بیٹھی رہی اس کا جی گھبرایا ہوا وحشت زدہ سا تھا چمکتے ہوئے ستاروں کی روشن کرنیں اندھیرے میں مٹتی جا رہی تھیں، اس کا دل سہما جا رہا تھا، زندگی کی بساط پر اس کی جیتی ہوئی بازی میں آگے بڑھے ہوئے مہروں کو تین ستاروں کے اژدھے جیسے نگلتے جا رہے تھے، وہ جب بھی ہارلی کے شانوں پر چمکتے ہوئے نشانوں کو دیکھتی تو تین ستاروں والے "کیپٹن" کے نام سے اس کا جی گھبرانے لگتا —— !

فوجی وردی نے ہارلی کو بے جھجک اور بے تکلف بنا دیا تھا ستی کی شرمیلی نگاہوں کے حجاب بھی اُٹھتے گئے وہ اس پرانی دنیا کو بدل دینے کے عجیب عجیب سے خوش آگیں خواب دیکھتے رہے۔ ستی نے بہت سے جدید ناول اور نئے نئے افسانے پڑھے تھے۔ موت کی آغوش میں سو جانے پر بھی زندہ رہنے والی ہستیاں اسے بہت عزیز ہو گئی تھیں، کبھی کبھی اپنے خوابوں میں وہ خود کو بھی ایسی ہی زندگی سے روشن دیکھتی تھی۔ اب اُس نے سمجھ لیا تھا۔ کہ انسانیت کو تباہی سے بچانے کے لئے کبھی مقابلہ بھی ضروری ہے۔ ہارلی کی خاکی وردی پر اس کی نگاہیں فاتحانہ طور پر پھسلتیں اور کاہی رنگ کی فوجی ہیٹ کے سامنے کا اُبھرا ہوا سنہرا پھول اس کو قسمت کا چمکتا ہوا

ستارہ نظر آتا۔ وہ ہارلی کی آواز میں جنگی بگل اور فوجی بینڈ کا مسرت آگیں نغمہ محسوس کرتی۔ جنگ کے آتشیں شعلے انسانیت کو بھسم کرتے جا رہے تھے۔ ہارلی امن کا فرشتہ بن کر اُسے پُر سکون سائے میں لانے والا تھا، پھر بھی "کیپٹن" کے نام سے اس کا جی لرز اُٹھتا، وہ کبھی کبھی حسرت سے اس کی آنکھوں کو دیکھتی "کیا ان حسین آنکھوں میں مسکراہٹوں کی چٹکتی ہوئی کلیاں وہ پھر کبھی دیکھ سکے گی"؟

ہارلی کی چھٹیاں ختم ہو گئیں، اُسے جنگ کی بھڑکتی ہوئی آگ میں سے ہو کر دُنیا اور زندگی کو بچانا تھا۔ پیلے نیلے سُرخ اور سفید پھولوں کے ہاروں سے چھپا ہوا وہ ریل کے دروازے پر خاموش کھڑا ہوا سب کو الوداعی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ جب اُس نے ستّی کو دیکھا تو اس کی پلکیں تھرتھرانے لگیں۔ ستّی اپنے اُمنڈتے ہوئے آنسوؤں کو مشکل سے روک رہی تھی۔ اس کا چہرہ تمتمایا ہوا تھا۔ اور اس کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔ اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے ہارلی نے جب اس کی اُنگلیوں کو زور سے دبایا تو وہ چونک اُٹھی۔ ہارلی کا غمگین اُترا ہوا چہرہ افسردہ نگاہیں اور اس کے شانوں پر جھلکتے ہوئے ستاروں کو وہ اپنی نگاہوں سے اوجھل ہوتے ہوئے بہت دُور تک دیکھتی رہی ——!

ستّی نے ہارلی کے چلے جانے کے بعد جنگ کی اہمیت کو صحیح طور

پر سمجھا اخبارات اس کی زندگی کا جزو بن کر رہ گئے تھے۔ اس کی نظریں بے تابی
سے موٹی موٹی سرخیوں پر دوڑتیں۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکتا اور پُر نم
آنکھیں کبھی کبھی اشکبار ہو جاتی تھیں۔ بہت دن ہوئے جنگ کے شروع شروع
میں اس نے پولینڈ اور وارسا کا نام سُنا تھا، مگر ایسے ہی سرراہے اسے ان
باتوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ ویسے تو وہ ایک مدت سے سُن رہی تھی کہ چین،
اسپین اور حبشہ میں جنگیں ہو رہی ہیں۔ اور اب یہ بھی جنگ کی ایک معمولی
سی خبر تھی مگر اسے حیرت تھی کہ لوگ اسے اتنی اہمیت کیوں دے رہے
ہیں ؟ ہارلی نے حسب موجودہ جنگ کا نقشہ اخبار میں دکھا کر اس کو بتایا تھا۔
کہ یہ "پولینڈ ہے یہ وارسا اور جرمنی نے یہاں کیوں چھیڑ نکالی ہے"۔ تو بھی
سلّی نے ان ٹیڑھے ترچھے نقشوں کو بے دلی سے دیکھا تھا۔ اس کے بعد وہ
اخباروں میں غیرت مند بہادر اور مظلوم پولوں کی دردناک تصویریں دیکھتی رہی
تھی، انہیں دیکھ کر اس کا دل ان کے لئے دُکھتا ضرور تھا۔ مگر اب اچانک اتنے
دنوں کے بعد انہیں تصویروں کی یاد اسے تڑپا رہی تھی۔ وقت اور زمانے
کی نبض کی دھڑکن سلّی نے اپنے دل کی تیز دھک دھک میں سُنی تھی۔ اُس
نے پرانے پرانے اخباروں سے پولوں کی افسوسناک تصویریں نکال کر رکھیں،
اس کو پولینڈ، حبشہ، یونان اور چین سارے مظلوم، ستائے ہوئے ملکوں سے
محبت ہونے لگی تھی۔ قتل گاہوں کو جاتے ہوئے پولوں کی حسرت ناک تصویروں

سے لپٹ لپٹ کر رونے کو بے اختیار اس کا جی چاہتا تھا۔ مدتوں کی دیکھی ہوئی ایک تصویر اس کے حافظے پر اُبھری۔ بڑی بڑی مخمور آنکھوں والی حسین شگفتہ سی تصویر اُسے دھندلی دھندلی سی یاد آئی۔ ڈاکٹر شوشنگ غریب ڈاکٹر شوشنگ آسٹریا کا محبوب چانسلر، پہلے پہل ظالم نازیوں کے بے درد ہاتھوں نے کتنی خاموشی سے اس کا گلا گھونٹ دیا تھا۔ اُسے ڈاکٹر شوشنگ کی تصویر بہت اچھی لگی تھی۔ اسی لئے اتنے دنوں کے بعد بھی وہ اُسے بھلا نہ سکی تھی۔ اسے سلّی نے اس وقت دیکھا تھا جب کہ وہ ہر چیز کو ایک پھسلتی ہوئی نظر سے دیکھنے کی عادی تھی۔ مگر اب ہارلی کی محبّت نے ان ساری دیکھی ہوئی چیزوں کو اس کی نگاہوں میں پھر سے زندہ کر دیا تھا۔ اسے ان سبھی مظلوم لوگوں سے محبت ہو گئی تھی۔ تین سال پہلے کی بے بس آہیں، پُھٹتے ہوئے بے تحاشہ آنسو اور زندہ گرم گرم خون کی جلن میں اب وہ اپنی روح کو بھی جلتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ اسے کیا معلوم تھا کہ پولینڈ کے وہ ٹیڑھے ترچھے نقشے اس کے دل میں بھی نشتر لگائیں گے۔ نظروں سے اوجھل ہوتی ہوئی وہ افسردہ نگاہوں کی جنبشوں میں اس نے کتنے تڑپتے ہوئے مایوس دلوں کی دھڑکنوں کو سُن لیا تھا۔ وہ اکیلی نہ تھی، بہت سی چیختی ہوئی روحیں، بے قرار حسرتیں اور سسکتی ہوئی امیدیں اس کے ساتھ تھیں۔ مقتلوں میں لے جائے جانے والے بدنصیب پولوں کی موت کے دہشت ناک رقص اس کی روح کے تاروں

پر تھرتھراتے اور ڈاکٹر شوشنگ کی پتھرائی ہوئی بے بس آنکھیں اسے ہر طرف سے تکا کرتیں۔ سلّی کو جرمنی سے نفرت ہو چکی تھی۔ بھیڑیوں کے سے خون آشام جاپانیوں کے زرد چہروں کو وہ جھلس دینا چاہتی تھی۔ اسے بار بار یہی محسوس ہوتا کہ وہ مظلوموں کے خون میں رنگا ہوا جھنڈا لئے آگے جا رہی ہے اور اس کے پیچھے غریب ستائی ہوئی معصوم روحوں کا ایک گروہ ہے۔ حبشیوں کے سیاہ چمڑوں کی جھلستی ہوئی بو اس کے دل و دماغ میں بس کر رہ گئی تھی۔ سلّی تنہائیوں میں کھولتی رہتی۔ اس کا جی چاہتا کہ آتش فشاں لاوا بن کر ہلاکت آفریں دشمنوں پر پھٹ پڑے۔ وہ فاسسٹوں سے ایک ایسا انتقام لینا چاہتی تھی جس سے زندہ جلائے ہوئے حبشیوں کی روحیں قہقہے لگانے لگیں۔ شہید پول اپنے مقتلوں میں خوشی سے جھوم جائیں۔ مظلوم چین کا کلیجہ ٹھنڈا ہو اور ڈاکٹر شوشنگ کی بے نور آنکھیں مسرت کی کرنوں سے جگمگا اٹھیں۔ وہ ہارلی کے لئے مضطرب ہو کر اب صرف اُسی کی خاطر بے چین نہ تھی۔ ہارلی کی جدائی نے کانٹے کے ٹکڑے بن کر سلّی کے دل میں دشمنوں سے نفرت کی تیز آگ کو سلگا دیا تھا مگر اب لپکتے ہوئے شعلے بلند ہو چکے تھے اسے اپنا گھر کاٹنے کو دوڑتا۔ بے اختیار اس کا دل چاہتا کہ انسانیت کو مٹانے والے فاسسٹوں کی بھڑکائی ہوئی جنگ کی آگ کو بجھانے کے لئے وہ پانی کا ایک چھینٹا بن کر میدانِ جنگ کی طرف دوڑتی

ہو نہ جائے —!

وہ سوچتی اگر کسی طرح نرس بن کر جنگ میں چلی جائے اور سفید ایپرن پہنے سر پر رومال باندھے۔ زخمیوں کی خدمت کرتی رہے۔ ایسے میں اچانک ہارلی کہیں دیکھ لے تو کیا اسے پہچان سکے گا؟ کتنی حیرت ہوئی ہے، بار بار وہ مڑ مڑ کر دیکھتا رہے نا۔ اور جب ستی اس سے یہ کہے کہ ہارلی میں تمہارے بغیر نہ رہ سکتی تھی تو کتنی خوشی ہو اس کو، مگر اس کا دل ڈوب جاتا۔ اور اس کی روح میں اُمڈا ہوا سیلاب ٹھہر جاتا وہ ایک مجبور، بے بس لڑکی تھی، جو سوائے سوچنے کے اور کچھ نہ کر سکتی تھی۔ اس کا خاندان عیسائی تھا مگر ابھی تک ہندوستانی روایات کی پرانی بندشوں سے پورا آزاد نہ ہوا تھا۔ ستی صرف سوچتی رہتی اور سوچتی رہتی۔

ہارلی کے خطوط میدان جنگ سے آتے رہتے، دشمن پسپا ہو رہے تھے۔ وہ اپنی فوجوں کے کارنامے سنتی تو اس کا دل خوشیوں سے بھر جاتا اطالیہ کے ڈھیروں ڈھیر چھینے ہوئے اسلحوں کی تصویریں ستی نے جب اخباروں میں دیکھیں تو اس بڑھتی ہوئی خوشی میں اس کا جی بنتا بانہ چاہا کہ وہ بھی کسی طرح ان تپتے ہوئے ریگستانوں میں پہنچ جائے اور وہاں جا کر یہ کہے کہ مجھے بھی اپنی فوج میں شریک کر لو، ان اسلحوں کے ڈھیروں میں سے مجھ کو لوہے کا ایک ٹوٹا ہوا پتر ہی دے دو پھر میں تمہیں بتا دوں گی کہ

جرمن بھیڑیوں سے مجھے کتنی نفرت ہے۔ اٹلی کے پیاز چبانے والے درندوں سے میرا دل کتنا چڑتا ہے اور پھر دنیا دیکھ لے گی کہ چین کے سکون کو چھین لینے والے جاپانی ٹیڑوں کے چہروں پر میں لعنتوں کے کیسے کیسے چنے لگا سکتی ہوں، مگر دل کی یہ چیختی ہوئی آواز اس کے دماغ کے گنبد میں بس گونج کر رہ جاتی۔ وہ چین کی جان فروش لڑکیوں کو جانتی تھی۔ وہ معصوم بھولی اور نازک نازک سی لڑکیاں جو اپنے خاندان اپنے عزیزوں اور اپنی محبتوں کو ٹھکرا کر اپنے وطن کی خاطر تکلیفیں اٹھا اٹھا کر چین کو زندہ رکھنے کے لئے گرجتی ہوئی توپوں کی گولیوں سے شہید ہو ہو کر ہمیشہ کے لئے زندگی حاصل کر چکی تھیں "زندہ چین" میں ستی نے "کامریڈ لاولی" کو اپنے وطن کی خاطر اپنی بیوی اور بچے سے چھپ کر بھاگتے ہوئے دیکھا اپنے بچے سے چھپ کر بھاگتے ہوئے دیکھا، اپنے بچے کے ننگے سر کو دیکھ کر لاولی کے باپ کا دل محبت کے بے پناہ جذبوں سے معمور ہو گیا تھا۔ اس پر بھی اپنی نگاہوں کو چراتا ہوا جب وہ صرف اس لئے گلیوں میں چھپتا ہوا بھاگا کہ وطن کے راستے میں اس کی بیوی اور بچہ کہیں حائل نہ ہو جائیں تو ستی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی ——! اس کو ان تمام لوگوں سے شدید محبت ہو گئی تھی، ان کے خفیہ جلسوں، چھپے راستوں اور سنسناتی ہوئی گولیوں کے آگے شہید ہوتی ہوئی ہستیوں کے ساتھ ہر

ہر جگہ وہ اپنے کو بھی محسوس کرتی تھی۔

ظالم اور سخت دِل جرمنی کے تختۂ دار پر روس کو زندہ رکھنے کی خاطر کمسن تانیا کو مسکراتے ہوئے جب سلّی نے شہید ہوتے ہوئے دیکھا تو وہ تڑپ اُٹھی۔ وہ تانیا کے خون کو کبھی معاف نہ کر سکتی تھی۔ اس کی روح میں ایک اہم تبدیلی رونما ہوئی اور ایک بہت بڑا انقلاب اس کی زندگی اور ارادے پر چھا گیا۔ اس کی سانس کے ایک ایک مدوجزر میں تانیا کا ماتم برپا تھا اور اس کی رگ رگ میں تانیا کی قیمتی زندگی کا انتقام لینے کی اینٹھن ہو رہی تھی۔ سلّی نے جب تانیا کی غم نصیب ماں کا پیغام دُنیائے انسانیت کے نام سُنا تو اس کا دل دُکھ گیا۔ اس کے جسم کا ریشہ ریشہ کانپ اُٹھا۔ سلّی کی غمناک روح پکار پکار کر اس سے کہہ رہی تھی کہ تانیا کی موت کا بدلہ وہ لے گی —!

اپنے وطن اور پنپتی ہوئی زندگی کو مٹانے والے دشمنوں سے مقابلہ کرنے کے لئے تانیا اپنے ہاتھ میں ایک بیگ لئے آخری بار موٹر کے اڈے پر سے اپنی ماں کی محبت بھری کانپتی ہوئی نگاہوں سے اوجھل ہو کر روس کے زندہ اور دھڑکتے ہوئے دِل میں ایک پُر عظمت دھڑکن بن کر جاوداں ہو گئی تھی۔ ہوا کی لہروں اور ریڈیو کے پردے پر تانیا کی دِل فگار ماں کی آواز لرز رہی تھی۔ اور ساری فضا میں تانیا کی آخری مسکراہٹ

چھا گئی تھی۔ کمرے کی تنہائیوں میں سّتلی کا جی چیخ چیخ کے رونے کو چاہ رہا تھا اس کی آنکھوں میں آنسو چل رہے تھے اور اس کا دل تانیا کی المناک موت سے سوگوار تھا۔ ریڈیو کے پہلو میں میز کے کونہ پر رکھی ہوئی ہارلی کی تصویر کو سّتلی نے بے اختیار نظروں سے دیکھا۔ فوجی وردی میں اس کا وہی پُرزدتاًا چہرہ اس کے سامنے مسکرا رہا تھا۔ سّتلی کے کانپتے ہوئے لب زور سے تھرتھرائے "ہارلی۔ میری تانیا"۔ وہ اس کی تصویر کے آگے میز پر اپنا سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس کو ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے بچپن میں ساتھ کھیلی ہوئی اس کی عزیز تانیا جرمنوں کی خونی پھانسی پر لٹک رہی ہے۔ سّتلی کو یہ معلوم نہ ہو سکا کہ وہ کس لئے رو رہی ہے؟ مردہ جسم میں تانیا کی کھلی ہوئی آنکھوں میں بے بس امیدوں کے خیال سے یا جنگ کے شعلوں میں ہارلی کے بچھڑے ہوئے تبسّم کی یاد میں؟ ریڈیو پر تانیا کی ماں کا پیغام اب ختم ہو چکا تھا۔ مگر ہوا کی لہروں پر جیسے ابھی اس کے آنسو لرز رہے تھے۔ سّتلی نے اپنا سر اٹھایا ہارلی کی آنکھوں میں مستقبل کے ارادے کی روشن کرنیں جھلک رہی تھیں۔ وہ اس کی تصویر کو تکتی ہوئی ریڈیو کے سامنے اپنی مضطرب روح کا پیغام جیسے ہارلی کو بھیج رہی تھی۔ ہارلی۔ مجھے اس کی خوشی ہے کہ تم دُنیا کو برباد کرنے والے فاسسٹوں سے لڑ لڑ کر اُٹھتی ہوئی زندگی کو بچا رہے ہو"۔ نفرت کی ایک

تیز لپک اس کے چہرے کو تمتما گئی۔ غصّے کی آگ میں اس کی انفرادیت کا شعلہ بھڑکا — "خونخوار جرمن بھیڑیئے ایک مزدور بیوہ کی یتیم بچی کمسن تانیا کو پھانسی پر چڑھا کر خوشیوں کا نعرہ لگا رہے ہیں۔ اور چھوٹی ہوئی ہڈیوں کو چبانے والا جاپانی درندہ چین کے اسکول اور کالجوں کے بھولے بھالے بچوں کے معصوم خون سے اپنا ہاتھ رنگ کر دُنیا میں اپنی فتح کا شور مچا رہا ہے۔ مستقبل کے روشن آئینہ پر جنہوں نے اپنے گندے نجس ہاتھوں سے سیاہی پھیر دی ہے کاش ان کے خون سے میں اِس دُنیا کو دھو سکتی"۔ یکایک ہارتی کی ہنستی ہوئی آنکھوں سے جیسے اس کی روح کو ایک خوش آگیں پیام ملا، اس کے آنسوؤں کے چند بے قرار قطرے فریم کے شیشے پر ٹپک پڑے "میرے دل کے اتھاہ سمندر میں جس طرح تمہارے لبوں کا یہ تبسّم اور تمہاری محبوب نگاہوں کی عزیز شوخیاں محبت کے کنول بن کر لہکتی ہیں۔ اسی طرح ہارتی تانیا کی آخری مسکراہٹ کو تم روس کے زندہ لبوں پر درخشاں رکھو گے —! جنہوں نے چین کے سینے کو اپنے خونِ حیات سے گلزار بنایا ہے۔ ان کی فضاؤں میں تھرتھراتی ہوئی دردناک چیخوں کو فتح کے نعرے سُنا دو گے اور اُن کی گونج سے شہید کامریڈوں کے ساکت دلوں میں ان کی سوئی ہوئی دھڑکنوں کو تم بیدار کرو گے"

—! ایک لمحہ کے لئے اس کا دِل لرز گیا۔ جنگ کی آگ کہیں خود اس کی

اپنی زندگی کو خاکستر نہ بنا دے۔ تب بھی وہ مطمئن تھی وہ راکھ کے ڈھیر سے بگولہ بن کر اُٹھے گی اور دشمنوں پر چھا جائے گی۔!

جب دنیا میں جنگ کی آگ لگی ہوئی تھی اور گھر گھر میں ماتم برپا تھا۔ تو ایسے وقت میں ستّی نے گھر میں آرام سے رہنا قبول نہ کیا۔ وہ مخالفتوں کو برداشت کرتی ہوئی عورتوں کی فوجی امدادی کمیٹی میں شریک ہو گئی۔ اس کے دل کو اب ایک گونہ سکون ملا تھا۔ جب وہ اپنی قوم اور اپنے ملک کی ہمدرد عورتوں کے ساتھ جنگ پر گئے ہوئے بہادر سپاہیوں کے لئے سویٹر۔ مفلر اور موزے بُنتی تو لوہے اور کپڑے کی نیلی پیلی اور سفید تیلیوں پر اس کی مسرور نگاہیں خوشی اور فتح کے ترانے گاتی ہوئی ناچتیں۔ سارے کمرے میں ایک مسرّت آمیز خاموشی چھائی رہتی اور وہ سب کی سب میزوں پر جھکی چپ چاپ اپنے کاموں میں منہمک رہتیں۔ کمرے میں ٹکراتی ہوئی تیلیوں کی ہلکی سی کھنک اٹھتی۔ قینچیوں کا شیریں نغمہ کبھی کبھی گونجتا اور محبت پاش نگاہیں اپنے سے بہت دُور ان عزیز ہستیوں کے تخیل سے سرشار رہتیں جو دُنیا کو تباہی سے بچانے کے لئے جنگل، بیابان اور نہ جانے کہاں کہاں پھر رہے ہوں گے —— کبھی کبھی بینڈیج اور زخموں کے لئے پٹیاں بناتے ہوئے خوف کی ایک لہر اس کے سارے جسم میں دوڑ جاتی اور کئی طرح کے خیال اس کے دل میں آنے لگتے۔ مگر اس کی آنکھیں

پھر بھی مُسکرا اُٹھتیں اب وُہ ہر گھڑی سوچتی رہنے والی ڈرپوک ستّی نہ رہی تھی، خون کے چھینٹوں سے وُہ دُنیا کا مستقبل روشن اور گلزار بنانا جان چکی تھی۔ جب وُہ اپنے ہاتھوں کی بنائی ہوئی ڈھیروں ڈھیر چیزیں جنگ میں جاتے ہوئے دیکھتی تو اُس کا دل فخر و مسرّت سے لبریز ہو جاتا۔ جنگ کے ان شعلوں میں کتنے ہارآلی بھول گئے! اور اسے ان سارے ہارآلیوں سے محبّت ہو گئی تھی۔ جنگ اس کی زندگی میں ہارآلی کی وجہ سے آئی مگر اب چینی اور روسی لڑکیوں سے مسابقت کی تمنا نے جنگ کو قومی تحریک بنا کر اس کے لئے اسے اتنا عزیز بنا دیا تھا کہ ہارآلی کی محبّت بھی اُس کا ایک جزو ہو کر رہ گئی تھی۔

جنگ کی گھٹا ٹوپ بدلیاں ہندوستان پر ہر طرف سے چھا گئیں ضرورتوں کی چھوٹی چھوٹی چیزیں بھی نایاب ہونے لگیں۔ زندگی ایک صحرا کی طرح بے رونق اور اجاڑ ہوتی جا رہی تھی۔ ستّی کا پیارا ہارآلی بھی اسی جنگ کی وجہ سے اس سے الگ ہو گیا تھا۔ اس کے لئے یہ سب سے بڑی مصیبت تھی مگر ایسے وقت میں ستّی کا دل صرف اس خیال سے کچھ سکون حاصل کر لیتا تھا کہ اس کا عزیز ہارآلی فوجی وردی پہنے اپنے ہاتھوں میں رائفل لئے دشمنوں سے مقابلہ کر رہا ہے۔ اس کی نگاہوں میں ہارآلی کی پیشانی پر انسانی عظمتوں کا پُروقار چمکتا ہوا ستارہ رقص کرنے لگتا۔

فاسسسٹ عفریتوں سے انسانیت کی فیصلہ کُن جنگ لڑی جا رہی تھی۔ پھٹتے ہوئے بموں کے تاریک دھوئیں اور بہتے ہوئے خون کے دریا میں کبھی کبھی سلمیٰ کا دل بھی ڈوبنے لگتا۔ اس کے آنسوؤں اور مضطرب خیالوں کی طرح اس کی رُوح بھی بے چین تھی۔ دن گزرتے گئے اور خط کا انتظار شدید سے شدید تر ہوتا چلا گیا۔ اس کی منتظر نگاہیں تھک گئیں اور اس کا جی گھبرایا گھبرایا سا رہنے لگا۔ ایک مبہم سا خوف اس کے دل و دماغ پر چھا رہا تھا۔ اسے جرمنی اور جاپان سے انتہائی نفرت ہو چکی تھی، وہ اڑتے ہوئے جہازوں کو دیکھتی تو بے اختیار اس کا جی چاہتا کہ ان کے پھیلے ہوئے پروں سے لٹکتی ہوئی وہ دشمنوں پر زہریلا بم بن کر جھپٹ پڑے۔ کبھی کبھی وہ تلملا جاتی، اسے ہلاکت خیز جنگوں سے وحشت ہونے لگتی جس نے اس کے ہارڈی کو اس سے چھین لیا تھا، اس کی زندگی کے خون کا ایک ایک قطرہ ہارڈی کے دل و دماغ پر چھائے ہوئے خوابوں کو درخشاں کرنے کے لئے بے قرار ہو اُٹھتا۔ جنگ کی بھیانک تاریکیوں میں چھُپ کر ہارڈی سلمیٰ کی نگاہوں کو اب بہت زیادہ عزیز ہو چکا تھا۔ اس کو ہارڈی کی ایک ایک بات یاد آتی، اس کی وہ شوخ سی آنکھیں لمبی لمبی سیاہ پلکیں، خوبصورت سے تبسم زیرِ لب، رُوح میں تیرنے والی مسکراتی ہوئی نگاہیں، اور کہکشاں کی طرح وہ روشن سی حسین پیشانی ہارڈی کی ریشم کی طرح جھلکتی ہوئی نرم نرم

انگلیاں، اس کے ناخنوں کے سفید ہلال اور ان کی پیازی سی پیازی رنگت، یہی ــــــ دور افتادہ چیزیں ستّی کی زندگی کا سرمایہ بن کر اس کی نگاہوں اور سینے سے لگی ہوئی تھیں۔ ہارؔلی اس کا اپنا ہارؔلی جنگ کے شعلوں میں جھونک دیا گیا تھا۔ ہارؔلی سے بے خبر رہ کر جنگ کے دھندلکے میں کبھی کبھی اسس کو ہارؔلی کی روشن آنکھیں خاموش اور بند نظر آتیں، اس کا دل کراہ اٹھتا، ٹوٹے ہوئے دل میں ایک آس بندھتی کہ اس کے ہارؔلی کی عزیز آنکھیں بند ہو کر بھی دُنیا، انسانیت اور تہذیب کی آنکھوں میں ہمیشہ روشن رہیں گی" ــــ! وہ ٹوٹی ہوئی خاموش خاموش سی رہنے لگی۔

کچھ دنوں کے بعد اسے یہ خبر ملی کہ ملایا کی گھری ہوئی فوج کے ساتھ ہارؔلی گرفتار ہو گیا ہے۔ بیمار دل کی ڈوبتی ہوئی نبض جیسے ابھر آئی۔ ستّی کی آنکھوں کے دھندلے نقوش پھر سے روشن ہو گئے۔ مگر اس کی روح میں بپاشدہ انقلاب اور انفرادیت کی تیز لہروں کو دھچکا سا لگا جاپانیوں کے پُر مظالم قید خانے اور زندگی کو ٹکڑے ٹکڑے کر دینے والی دل خراش اذیتوں کا خیال ڈنک مارتے ہوئے بچھو کی طرح اُس سے لپٹ گیا، پھر بھی اسے خوشی تھی کہ ہارؔلی زندہ تو تھا! اس کی کھلی ہوئی آنکھوں میں پُر عظمت ارادے اب بھی پر فشاں ہوں گے۔ اور اس کی ہر ایک سانس ایک مقیّد حباب کی طرح بھری ہوئی ہو گی۔

ما۔لی جاپانیوں کا قیدی بن کر تاریکیوں میں چھپ گیا تھا۔ ہندوستان کے گھر گھر میں پریشانیاں چھا گئی تھیں۔ ستّی کی روح پر چرکے لگتے جا رہے تھے۔ ستّی چوٹ کھائی ہوئی ناگن کی طرح فاسسٹوں کو ڈس لینے کے لئے بےچین تھی۔ وہ فوج میں گئے ہوئے سپاہیوں کے گھروں میں جا جا کر ان کی ضرورتوں کو دیکھتی۔ وہ دیہات کی سڑتی ہوئی گلیوں میں چکّر لگاتی۔ میلے اور تنگ مکانوں میں جا کر لام پر گئے ہوئے سپاہیوں کے عزیزوں سے ملتی۔ ان کے ننھے ننھے بچوں کو کھلونوں کی تلواریں اور بندوقیں دے کر ان کی معصوم روحوں کو ان کے گھروں کو لوٹنے والے فاسسٹوں سے نفرت دلاتی۔ اپنے بچھڑے ہوئے عزیزوں کو دشمنوں سے چھین لانے کے لئے ان کے چھوٹے چھوٹے قدموں سے ان کو پریڈ سکھاتی۔ اسے ان گندے گندے بچّوں سے محبت ہو گئی تھی۔ وہ اپنے کو بہلانے کے لئے ان جیتے جاگتے کھلونوں سے اپنا محبوب کھیل کھیلتی رہتی۔ اپنی طرح دکھی اور بیگانہ فضا میں اس کے دل کے زخموں پر کچھ ٹھنڈک سی پڑ جاتی تھی۔ جنگ اور نازی ہولناکیوں سے بے خبر، اپنے بچھڑے ہوئے عزیزوں کو یاد کرتے ہوئے بیمار بچوں کو ستّی تسکین دیتی رہتی، اور جب بھولے ہوئے خواب دیکھتی ہوئی خاموش اور صابر آنکھوں والی سپاہیوں کی بیویوں کی . . . وہ تیمارداری کرتی تب اس کا دل مطمئن اور پر امنگ رہتا۔

دیہات کی بجبجاتی ہوئی تنگ گلیوں میں اس کے زخمی پیر جوتے ہیں مسل مسل جاتے تو اس کی جھومتی ہوئی پُر سرور روح کو یوں محسوس ہوتا جیسے اینٹ اور پتھروں کی نوکیلی زبانیں ہر طرف سے اسے پکار پکار کر کہہ رہی ہیں کہ وہ بھی اپنے وطن کی ایک "ٹنگ لنگ" ہے اور ایک جان فروش تاآنیا۔

ستی خوش تھی کہ اپنی حیات اپنے وطن اور اپنے بچھڑے ہوئے ہاتسی کے لئے جنگ کی قربانیوں میں وہ پیچھے نہ تھی، سارا سارا دن وہ تکلیف دہ راستوں پر گذرتی ہوئی اپنے ملک کی خدمت کرتی اور اس کے بعد وہ جنگی قیدیوں کو بھیجنے کے لئے ریڈ کراس کے لئے تحفے بناتی۔ اُس نے بہت سے پُر جوش افسانے لکھے، بہت سی زندہ بولتی ہوئی سحر انگیز، سرشار نظمیں لکھیں، وہ قیدیوں کی رگوں میں جمتے ہوئے خون کو اپنے دیپک راگ سے شعلہ فشاں رکھنا چاہتی تھی۔ اس کو ریڈ کراس سے بے تابانہ محبت محسوس ہوتی، جہاں کوئی نہ جاسکتا تھا وہاں صلیب احمر کی مریم، مامتا کا بیقرار آغوش کھولے بچھڑے ہوئے غمگین بچوں کو اپنے کلیجے سے لگانے کو پہنچ جاتی۔

تھکی ہوئی چُور چُور ہو کر وہ شام ہونے سے پہلے کسی نہ کسی طرح نبضیں اٹھا کر ضرور واپس آجاتی اور کمرے کی تنہائیوں میں ریڈیو کے سامنے منتظر بیٹھ جاتی۔ اس کے جسم کا بند بند دُکھتا رہتا، اس کا جی بے اختیار

چاہتا کہ کوئی اس کے کاموں کو سراہے، گھر کے لوگ اسے دیکھ کر بے معنی ہنسی ہنس دیتے۔ مگر جب وہ ہارلی کی مسکراتی ہوئی تصویر کو دیکھتی تو اس کا دل مسرتوں سے جھوم جاتا۔ وہ ہنستی ہوئی روشن آنکھیں ہر بار ستی کی روح کو ایک نیا اور اعلےٰ پیغام سناتی ہوئی محسوس ہوتیں، ریڈیو پر جاپانی خبریں چھ بجے سے نشر ہونے لگتی تھیں وہ جہاں بھی ہوتی بڑی خاموشی اور انہماک سے خبریں سنتی۔ اس کا دِل ہارلی کی کھوئی ہوئی آواز کو بس ایک بار سننا چاہتا تھا۔ وہی چاند کی یاسمین کرنوں کی جھنکار کا سا حسین نغمہ، وہ اپنے سامنے رکھی ہوئی تصویر میں ہارلی کی شرارت آمیز نگاہوں اور متبسم ریزہ لبوں کو تو دیکھ سکتی تھی مگر وہ خاموش تھے اور ستی اپنے بچھڑے ہوئے ہارلی کو ایک بار صرف ایک بار بولتا ہوا دیکھنے کو مضطرب تھی۔ اسی اُمید پر اس نے ریڈیو کے پہلو میں اس کی تصویر کو رکھا تھا کہ دم بھر کے لئے بھی اُسے یہ محسوس ہو سکے کہ ہارلی اُسے مخاطب کر رہا ہے، طوفان کی گڑگڑاہٹوں اور ہوا کی لہروں پر وہ بہت سی خبریں سنتی رہتی۔ بہت سے ٹوٹے ہوئے دلوں کی صدائیں آتیں، انجان اور مضمحل یادیں اس کے کانوں میں گونجتیں۔ بچھڑی ہوئی پُر درد دعائیں، افسردہ پیار و محبت اور حسرت آگیں پیغام روز سنائے جاتے مگر ستی اپنی پہچانی ہوئی آواز کی گونج نہ سُن سکی۔

غم سے چُور ستی کی آنکھیں ابھی تک اشک آلود تھیں، آج اُس نے

اپنے دورے میں دم توڑتی ہوئی سسکیوں اور پتھرائی ہوئی آنکھوں میں ایک شدید غمناک انتظار دیکھا تھا، ہندوستان کے گاؤں میں رہنے والے ایک قیدی سپاہی کی نو عمر بیوی مر رہی تھی، وہ کئی مہینوں سے بیمار تھی اس کا سارا جسم خون کی کمی سے سُوکھ گیا تھا۔ پاؤں میں چلنے کی سکت نہ ہونے پر بھی وہ روزانہ اپنے کو گھسیٹتی ہوئی دروازے تک لاتی اور اس کی پھٹی پھٹی کمزور نگاہیں اپنے شوہر کے خط کا شدید انتظار کرتیں، اُس نے سُنا تھا۔ کہ اس کا عزیز شوہر قید ہو چکا ہے۔ مگر وہ کاغذ کے پرزوں کو آزاد سمجھتی ہوئی خط کی منتظر تھی اور اب جب کہ وہ مر رہی تھی اُس وقت بھی اُس کی لڑکھڑاتی ہوئی زبان اور بجھتی ہوئی آنکھوں میں خط کا انتظار باقی تھا۔

مضطرب اور پریشان خیالوں کے ساتھ ستی ہمیشہ کی طرح ریڈیو کے سامنے بیٹھی ہوئی تھی، اس کی روح میں ایک طوفان اُمڈا ہوا تھا۔ نفرت کے شعلوں میں، اس کا دل جل رہا تھا، اس کی انگلیوں میں شدید اینٹھن ہو رہی تھی۔ وہ بزدل فاسسٹوں کا گلا گھونٹ دینے کو بے قرار تھی، اس کی پلکوں پر آنسوؤں کے قطرے کانپ رہے تھے، ریڈیو میں جلتے ہوئے دل کی طرح بلب روشن تھا۔ چمکیلے ریشم کے پردے سے ہواؤں کے جھونکے رہ رہ کر ٹکراتے ہوئے چیخ رہے تھے، گڑگڑ کی تیز آوازوں میں ستی کے پریشان خیالات اُلجھتے جا رہے تھے۔ اس کا جی اُکتایا ہوا اور بیزار سا تھا، اُس نے آواز کی کنجیوں

کو گھماتے ہوئے اُسے ٹھیک کر لیا۔ گڑگڑاہٹیں مٹ چکی تھیں اور اب صاف آواز میں روزانہ کی طرح خبریں سُنائی دے رہی تھیں۔ ہارلی کی میز پر رکھی ہوئی تصویر کو دیکھتے ہوئے سلّی نے سوچا کہ "اگر اتنے ناموں میں مرلی کا باپ بنسی بھی اپنی بیوی کو کوئی پیغام سُنائے تو آواز کی یہ لہریں دوسری دُنیا میں آج مرلی کی مری ہوئی ماں تک وہ باتیں پہنچا سکیں گی۔ ہوا کی لچکتی ہوئی موجوں پر جیسے کوئی کھویا ہوا سا نغمہ یکبارگی تیر گیا۔ "میں کیپٹن ہارلی، ابھی یہاں سیگاؤں سے بول رہا ہوں۔" سلّی کا دل زور سے دھڑک اُٹھا، وہ اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں میں جلدی سے ہارلی کی تصویر لے کر اُسے دیکھنے لگی، کتنی مدت بعد اُن ہنستے ہوئے لبوں سے وہ اس بچھڑی ہوئی آواز کو پھر سے سن رہی تھی۔ "جاپان کی انصاف پرور حکومت میں مَیں بہت خوش ہوں۔" دم بھر کے لئے ریڈیو کے پردے پر اس کی رکتی ہوئی آواز لڑکھڑائی۔ "جاپانیوں کی طرف سے نفرت اور بُغض پھیلانے کو بہت سے غلط اور جھوٹے پراپیگنڈے کئے جا رہے ہیں۔" ہوا کی موجوں میں ڈوبتی ہوئی آواز پھر سے اُبھری۔ "جاپانی مہمان نواز خلیق اور مہربان ہیں، وہ ہمارے دشمن نہیں دوست ہیں، وہ ہماری منتشر ایشیائی روحوں کو یکجا کرنے کے لئے قربانیاں کرتے ہوئے سرمایہ داروں سے جنگ کر رہے ہیں۔" —— "جاپان" —— ہواؤں کے طوفان ریڈیو کے پردے پر سر پٹکتے ہوئے چیخنے لگے۔ ریڈیو کے سامنے بیٹھی ہوئی سلّی

کی دیوانہ وار وحشت ناک نگاہیں ہارلی کی کانپتی اور لڑکھڑاتی ہوئی آواز سُن کر دور دراز اس کے بے بس پیکر پر جم کر رہ گئیں۔ جہاں وہ پستول اور رائفلوں کی اُٹھتی ہوئی نالیوں کے سامنے مجبوراً "بلوایا جا رہا تھا، لرزتی ہوئی کمزور آواز اس کی اپنی ضرور تھی مگر الفاظ اس کے اپنے نہ تھے۔ غم و غصہ اور نفرت کی ایک تیز رَو سلّی کی روح میں طوفان کی طرح اُٹھی ــــ "بزدل" "اپنے بھائیوں کے خون کے دریا میں تیرتا ہوا ایک سڑے ہوئے تنکے کا سہارا لینے والا ڈرپوک"۔ "کاش رائفل کی سنسناتی ہوئی گولیاں، اس کے سینے کو چھلنی کر دیتیں، وہ اس شان سے مر کر بھی زندہ رہتا۔ ایک اکیلی موت سے ڈر کر انسانیت کو تباہ کرنے والا بزدل" ــــ اس کا سارا جسم پسینہ سے تر نفرت سے کانپ رہا تھا۔ دِل کی تیز دھڑکن سے اس کی کنپٹیاں پھٹی جا رہی تھیں۔ اس کے ہر طرف جیسے آگ کے شعلے بھڑک رہے تھے "چین کے شہیدوں کا خون چوسنے والے جاپانی کُتے۔ ایک کمزور لڑکی معصوم تانیا کو پھانسی پر لٹکانے والے بزدل ڈاکوؤں کے ذلیل دوست"! وہ تھرا اُٹھی، اس کی نگاہوں کے سامنے اپنے نازک سفید گلے میں پھانسی کا پھندا لگائے ہوئے تانیا، مرلی کی مری ہوئی ماں کی پھٹی پھٹی منتظر نگاہیں گرجتی ہوئی توپوں سے چھلنی کی ہوئی چین کی شہید ہستیاں اور ڈاکٹر شورشنگ کی پتھرائی ہوئی بے نور آنکھیں اس سے التجا کر رہی تھیں۔ ریڈیو سے طوفانی ہوا ٹکرا رہی

تھی، کبھی کبھی چیختی ہوئی گڑگڑاہٹیں رہ رہ کر سسکنے لگتی تھیں۔ فریم کے شیشوں میں سے سلّی نے ہارلی کی تصویر نکالی۔ اس کی ہر ایک سانس میں نفرت کے شرارے تڑپ رہے تھے، اس نے جلتی ہوئی دیا سلائی تصویر کے نیچے لگا دی۔ آہستہ آہستہ پھیلتا ہوا دھواں اُوپر اُٹھتا گیا۔ پیلا پیلا مضمحل سا شعلہ بھڑکا ہارلی کی جلتی ہوئی وردی کے شانوں پر لگے ہوئے تین ستاروں کو دیکھ کر سلّی کا دل دھک سے رہ گیا، اسے مدتوں پہلے دیکھا ہوا اپنا خواب یاد آیا۔ وہ لرز اُٹھی۔ آسمان پر تین ستاروں کے مضطرب شعلوں میں اُس نے ہارلی کے مسکراتے ہوئے لبوں کو جلتے دیکھا۔ اس کی وہ ہنستی ہوئی وہ سحر آلود محبوب آنکھیں آہستہ آہستہ دھوئیں کی افسردہ تاریکیوں میں چھپتی گئیں۔ وہ لپکتے ہوئے شعلوں میں ہارلی کی خوبصورت پیشانی کو ڈوبتے ہوئے بے بسی سے دیکھ رہی تھی۔ ہارلی کے سیاہ بالوں کی موجوں پر پھسلتی ہوئی آگ زور سے بھڑکی۔ اور پھر بجھ گئی۔ سلّی کی تھرتھراتی ہوئی ٹھنڈی انگلیوں میں ہارلی کی جلی ہوئی تصویر کی راکھ کانپ رہی تھی۔

# کچّے دھاگے

وہ اسی گھر میں پیدا ہوئی، اسی کے گوشے گوشے میں بڑھی اور یہیں اپنی ساری زندگی گذار دی۔ کونا کونا اس کا جانا پہچانا ہوا تھا۔ اس گھر کے ایک ایک حصّے میں اس کے، بچپن اور جوانی کی بہت سی بیتی ہوئی گھڑیاں ——— گونج رہی تھیں۔ وہ اس کے باپ اور چچا کا مشترکہ مکان تھا۔ اس نے اس گھر کے سوا اور کوئی گھر نہیں دیکھا تھا۔ اور نہ دیکھنے کی اسے تمنا ہی تھی۔ باپ کے گھر کی محبت اور شوہر کے مکان کی اپنائیت اس نے اسی ایک جگہ میں پالی تھی۔ ماں کو تو اس نے دیکھا ہی نہیں تھا۔ بہنیں اپنے اپنے گھر بسا چکی تھیں۔ ایک

بھائی تھا جو دور دیس میں قسمت آزمائی کر رہا تھا۔ باپ اور سسر کے مرنے پر سارا گھر آنگن اس کا اپنا تھا۔ اور وہ اس سے بہت محبّت کرتی تھی۔ اسی گھر کی ایک دیوار تلے رہ کر اس کو لوگوں پر اپنی ساکھ جمانی تھی۔ گاؤں والے کیسے کیسے کچوکے اس کے دل پر لگاتے رہے تھے۔ اس کے خاندان پر ناک بھوں چڑھا چڑھا کر انہیں ناپاکی کی یادگاریں سمجھتے رہے تھے۔ اسے خود بھی اپنی آبائی کمزوری کا شدید احساس تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اس کے بزرگوں نے غربت اور گندگی میں سڑتی ہوئی ایک کمزور ہستی کو اپنے ہاتھوں سے بچایا تھا۔ اور یہی اخلاقی جراُت ایہی انفرادی بلندی، اور یہی طاقت اس کی نسلوں کے لئے ایک بہت بڑی خاندانی کمزوری اور کبھی نہ مٹنے والا کلنک کا ٹیکہ بن گئی تھی۔ اور اسی ذلّت کے نشان، اس کلنک کے ٹیکہ کو مٹانے کے لئے وُہ کوشاں تھی۔ اس کا شوہر یونین بورڈ میں جمعدار تھا۔ تنخواہ کی قلت کا اسے کچھ دُکھ بھی نہیں تھا۔ اپنے دروازے پر ڈوموں کے ایک ہجوم کو دیکھ کر اس کا دل کھل جاتا تھا۔ اپنے دروازے کے پٹ سے لگی ہوئی۔ وُہ اس شان و شوکت کو دیکھتی رہتی اس کے گرے پڑے مکان میں ایک زندگی سی آ رہی تھی۔ کہیں کہیں سے مٹی کی نئی دیواریں اٹھائی گئی تھیں۔ اور جگہ جگہ سیمنٹ، پلاسٹر اور چونے نے گھر کی کمزوریوں کو چھپا کر ایک چمک پیدا کر دی تھی۔ دیوار پر رینگتی ہوئی گھرنی بہت سے دلوں میں چبھتی رہی۔ "بڑھیا رے سنبھل کے رہنا نئی دیوار

اُٹھتی ہے اور پرانی دیوار گرتی ہے اس کے ساتھ کئی اونچے دماغوں میں ہتک کی کھوکھلی دیواریں بھی جھٹکے کھا رہی تھیں۔ کمرے اگرچہ تاریک تھے۔ مگر سرمئی سیمنٹ کی شطرنجی چادر سے آنگن لہک رہا تھا۔ آنگن کے ایک کنارے پہ نیلے رنگ کا نلکہ نہایت شاندار لگتا۔ اس کا ہینڈل اتنا ہلکا تھا کہ بچہ بھی چلا کر پانی نکال سکے۔ صبح شام سرمئی سیمنٹ کے اس شطرنجی آنگن میں ایک بھیڑ لگی رہتی۔ "گنو بوبو کے ایسا پانی کا نل تو کہیں بھی نہیں، کتنا ہلکا چلتا ہے یہ"۔ یہ سن کر اس کا دل مسرت سے بھر جاتا۔ پانی کے بھرے گھڑوں پر اس کی نگاہیں پھسلتی چلی جاتیں۔ اور پھر وہ اپنی ساری تکلیف بھول جاتی۔ سلائی کرتے کرتے اس کی انگلیاں زخمی ہو گئی تھیں۔ مگر اسے سیتے ہوئے کوئی نہیں دیکھتا تھا۔ جب اس کا جی چاہتا گھر کے دونوں دروازے بند کر کے اپنے کاموں میں لگ جاتی۔ اُسے کئی چیزوں کا شوق تھا۔ رنگ رنگ کی مینائیں اور طوطے پنجروں میں لٹکتے رہتے تھے۔ قسم قسم کی مرغیاں، چھوٹی چھوٹی بطیں، اور بڑے بڑے ہنسراج بط اس کے گھر میں ناچتے پھرتے۔ مرغیوں کے انڈوں اور چھوٹے چھوٹے چوزوں کو وہ چپ چاپ بیچ دیا کرتی۔ سلائی کے پیسے بھی اس کے پاس جمع رہتے۔ مگر یہ کام وہ اتنی خاموشی سے کرتی کہ اس کے شوہر کو بھی پتہ نہ چلتا۔ اور جب ہر تین مہینے بعد وہ اپنی چوکیداری کا کمیشن لاتا تو پھر گھر کی ساری پونجی ملا کر وہ کوئی کام کرتے، نمایاں اور واضح

کام۔ جس سے گھر گھر میں چرچے ہوتے۔ وہ ساری بستی سے مِل جُل کر رہنا چاہتی تھی۔ کتنے ہی اس کے اخلاق کے گرویدہ ہو چکے تھے۔ اس کے یہاں عورتوں کی ایک ٹولی جمع رہتی تھی۔ اور وہ کسی کے بچّے کے لئے فراک سی دیتی۔ کسی بچّے کو سنوار نکھار دیتی۔ اور کبھی گڑیا بنا کر اس کی شادی رچا دیتی۔ وہ جھرمٹ میں بیٹھی ہوئی رانی کی طرح مسکرایا کرتی جب اس کے کانوں میں چوڑی بیل کی جالیدار سونے کی بڑی بڑی بالیاں جھولنے لگتیں، تو اس کے چہرے کی سیاہ جلد پر ایک پُرمسرت سی رونق چھا جاتی ——! اس کے گھر میں بڑی دلچسپیاں رہتیں۔ خرگوش کے چھوٹے چھوٹے بچّے پھدکتے رہتے، بط کے ننھے ننھے سے سنہرے رنگ کے ریشم جیسے ملائم بچے پانی میں تیرتے ہوئے بڑے حسین نظر آتے، قائیں قائیں کرتے ہوئے ہنسراج اپنی لمبی لمبی گردنیں بڑھاتے ہوئے کھانے کو مانگتے، اور سامنے دیوار میں کاٹھ کے خانہ وار ڈبے، کابک کی صورت میں ٹنگے رہتے۔ جس میں سے سفید، بھورے، مرمئی اور چتلے کبوتر اپنی گردنیں باہر نکالے مٹر مٹر تاکتے ہوئے بہت اچھے لگتے تھے۔ کبھی کبھی اس کا گھر ایک چڑیا گھر کی طرح لگتا۔ جب وہ صبح شام آ کر کبوتروں، مرغیوں، اور بطوں کو دانا کھلاتی تو پھڑ پھڑاتے ہوئے رنگ برنگ پرندوں سے اس کا گھر بھر جاتا —— اس کے ناکے پر ایک رونق رہتی،

چاول کوٹنے کی ڈھنکی پر بھی اکثر ایک بھیڑ لگ جاتی تھی۔ طرح طرح کے گیت گائے جاتے اور خوب خوب دھما چوکڑی مچتی۔ اس گھر کی آزادی بھی غنیمت تھی، بے چارا جمعدار صبح کا گیا ہوا چھ سات بجے شام کو واپس آتا۔ اور اُن کے لئے یہ وقت بہت کافی تھا ـــــ! اُریبی پائجامہ، لمبا کوٹ اور ہاتھ میں مڑا ہوا چھاتا ہر روز وہ ایک ہی طرح سے اندر داخل ہوتا تھا۔ سارا گھر صاف سُتھرا رہتا، دیوار میں جڑی ہوئی چھوٹی سی فیروزی رنگ کی الماری کے نیچے ایک چوکی بچھی رہتی۔ اور وُہ ہاتھ مُنہ دھوکر اسی پر ناشتہ کیا کرتا تھا۔ اس کی بیوی گرما گرم گھی سے تر چوکور روٹی گوشت اور گھر کی مرغی کا تلا ہوا انڈا اور چائے کا مختصر سا سامان اس کے پاس رکھ دیتی تھی۔ اس وقت سامنے کی الماری کھُلی رہتی۔ جس میں سلیقے سے چائے، چینی، شہد چٹنی اور مختلف قسم کے اچار چٹنی اور شیشے کے مرتبانوں میں بھرے رہتے، اسی الماری کے دوسرے تختے پر چینی کی پھولدار رکابیاں، کنارے دار بیل بنے ہوئے بڑے بڑے پیالے، گہرے گہرے قاب اور فیروزی، نیلے اور سبز رنگ کے شیشے کے گلاس دور ہی سے جھلک کر لوگوں کے دلوں میں تکلیف دہ ہوک پیدا کر دیتے تھے۔ اسی اسارے کے ایک طرف بانس کی لمبی سی الگنی لٹکتی رہتی تھی۔ جس پر تہ کئے ہوئے لحاف، نرم نرم کمبل، گرم کوٹ اور بارینہ کے شلوکے ایک سفید چادر سے ڈھکے ٹنگے رہتے۔

—— ! اسس کے گھر میں ڈوموں پر حکومت چلائی جاتی تھی - اور جہاں اس کا جی چاہتا صفائی کرا کے لوگوں پر نمایاں احسان کرتی اور جو اپنے آپ کو بلند سمجھے ہوئے تھے ان کے دروازے پر کوڑے کے ڈھیر ان کی بڑائی پر خندہ زن رہتے - صفائی کے علاوہ اور بھی بہت سے کام تھے، غلہ پھٹکنے والے سوپ چنگیری، پان رکھنے کی ڈلیا اور بڑے بڑے ٹوکرے بھی ڈوموں ہی سے بنوائے جاتے تھے —— ! چونکہ ان چیزوں کی سب گھروں میں ضرورت رہتی تھی - اس لئے وہ اپنے ہاتھوں سے سبھوں کو سوپ چنگیریاں مفت ہی بانٹتی رہتی —— اس کا دل مطمئن تھا - وہ اپنے اسس چھوٹے سے گھر کو جنت بنائے ہوئے تھی شادی بیاہ کی مجلسوں میں اس کی اچھی اچھی ساڑھی، نئی جوتیوں اور کانوں میں سونے کی بالیوں کو بستی والیاں بڑی حسرت سے دیکھتیں —— ! یہ سب کچھ تو تھا، مگر فطرت کے آزاد قانون پر اس کا بس نہیں چل سکتا تھا. اسے بہت دنوں پہلے بھی ایک عجیب طرح کا کمزور سا بے ہڈی کا بچہ پیدا ہو کر مر گیا تھا - اور اب پھر اس کی گود میں اسی طرح کا ڈراؤنا سا بچہ آ گیا تھا —— ! عجیب ہیئت کا بچہ، جس کے انتہائی چھوٹے سر کے سیاہ کڑے کڑے بال ہر وقت کھڑے رہتے تھے - گردن ڈھلکتی رہتی تھی - اور چہرے پر ایک وحشت اور تکلیف طاری رہتی - اسس کی تنی ہوئی

آنکھیں بے رونق سی تھیں۔ منہ سے ہر گھڑی رال ٹپکتی رہتی تھی۔ اور باہر نکلی ہوئی زبان سے بس ایک ہی آواز نکلتی رہتی، گِل گِل گِل گِل۔ —— باسی گگڑی کی طرح لٹکتا ہوا بے ہڈی کا بچہ اس کی بے بس گود میں جھولتا رہتا —— ! تضحیک آمیز مسکراہٹیں اس کے دل پر نشتر لگانے لگتیں۔ اور وہ آنکھیں آنکھوں میں ہوتے ہوئے اشاروں کو دیکھتی رہتی۔ ہمسایہ کے "اونچے" خاندان سے اکثر تیز تیز آوازیں بھی سنائی دیتیں —— " ایسے ایسے گھروں میں تو راکشس پیدا ہوتا ہی ہے۔ دیکھ لینا چند ہی دنوں میں اس کے مُنہ سے آگ نکلنے لگے گی"۔ مگر اس نے اپنے آپ کو جیسے ان ساری باتوں سے بے پروا بنا لیا تھا۔ وہ ہمیشہ کی طرح اسی انہماک سے رنگین جھالردار فراکیں سی سی کر اسے پہناتی۔ اور جھولے کی رسیوں میں رنگین پنگوڑا بھی لٹکتا رہتا تھا۔ ماستا سے مجبور ہو کر یا لوگوں کو چڑانے کے لئے وہ اس گِل گِل کرتے، رال ٹپکاتے ہوئے بچے کو اپنے سینے سے لگا کر خوب خوب چومتی۔ اسے ہاتھوں پر اچھالتی۔ اور پھر رنگدار سُتلی کے لال لال پنگوڑے پر ڈال اسے آہستہ آہستہ جھلاتی ہوئی لہک لہک کر زور زور سے لوریاں دینے لگتی —— !

اس کے کئی بچے بچپن میں مر گئے تھے۔ منتوں اور مرادوں کی مانی

ہوئی ایک بیٹی بمشکل دس سال کی ہو سکی تھی۔ وہ بھی اچانک ایسے ہی پیٹ کے درد کے بہانے مر گئی تھی۔ اس کی موت کے بعد بہت دنوں تک دونوں میاں بیوی اپنا سر نہ اٹھا سکے تھے۔ مگر جیسے جیسے سال بیتتے گئے، غم بھی پرانا ہوتا گیا —— ! رگی گل کرتا ہوا بے ہڈی کا ہر بچہ بھی زیادہ دنوں تک نہ ٹھہر سکا۔ اور اس کی گود بھرا اُجاڑ ہو گئی۔ خالی ہنگوڑا اسارے کی لمبی کھونٹی میں مایوسانہ طور پر اوندھا کر دیا گیا —— گھر کے کونے کونے سے غمناکیاں برس رہی تھیں۔ کابک کے نیچے کبوتروں کی بیٹوں کا ایک جھاڑ سا جم گیا تھا۔ غسل کی کچی پکی لاہیوں سے شطرنجی آنگن گھناؤنا ہو گیا۔ سرشام ہی بط، مرغ، اور چنیا مرغی گھر کے مختلف کونوں، کھدروں اور بستروں میں دبک جاتیں۔ ایک عجیب سراسیمگی سی سارے گھر پر چھائی رہتی تھی۔

گذرتے ہوئے وقت کی پرچھائیوں اور رات کی تاریکیوں سے بچ بچ کر بارہ میں سے صرف دو بچے اس کے پاس رہ گئے تھے۔ اور وہ بھی کتنے جوکھوں کے بعد موت کے فرشتے کو بچوں کے عجیب عجیب ناموں سے دھوکہ دے کر اس نے گویا انہیں موت کے ہیبت ناک منہ سے چھین لیا تھا۔ اور اب وہ انہی بچوں کو غنیمت سمجھ رہی تھی۔ لال پیلے کپڑوں میں لپٹی ہوئی تعویذوں اور شیر کے خوفناک ناخنوں کا ہار بچوں کے گلے میں پڑا رہتا —— لیکن ابھی اس کے گھر میں پھر سے رونق آ ہی

رہی تھی، کہ یکایک اس کا شوہر شدید طور پر بیمار ہو گیا۔ ہفتوں اس کے منہ سے خون آتا رہا کھانسی اور بخار سے رہی سہی طاقت بھی ختم ہو گئی، اور وہ بالکل پلنگ پر گر گیا۔ پھر بھی بیوی کی اُمیدیں قائم تھیں۔ وہ اسے کسی نہ کسی طرح علاج کے لئے شہر لے گئی۔ مگر ڈاکٹر نے واپس کر دیا۔ تھائیس کا تیسرا درجہ بھی اب ختم ہو رہا تھا۔ وہ پریشان تھی۔ کہ صرف دو مہینے میں یہ کیا ہو گیا؟ —— تنخواہ تو بند ہو ہی چکی تھی۔ اس کے شوہر کے بغیر یونین بورڈ کا کوئی کام رُکا ہوا نہیں تھا۔ ڈوموں کی حاضری اب ایک دوسرے دروازے پر ہونے لگی تھی۔ اگرچہ اس کی زندگی کی چلتی ہوئی گاڑی کے پہیے ٹوٹ گئے تھے۔ پھر بھی وہ اسے گھسیٹنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ بارہ روپے کی قلیل تنخواہ کا سہارا بھی ٹوٹ چکا تھا۔ لیکن وہ گھر کی ساری چیزیں بیچ کر بھی اسے اچھا کر دینا چاہتی تھی۔ اب اس کے کان کی لویں خالی ہو گئی تھیں۔ لیکن وہ اپنے شوہر کی زندگی کے سامنے سب چیزوں کو ہیچ سمجھ رہی تھی —— ! اس کی جنت اجڑتی ہی جا رہی تھی۔ اس کے شوہر کا لپٹا ہوا سیاہ چھاتا، جو پر مسرت دنوں کی یادگار تھا، پہلے کی طرح اپنی مخصوص کھونٹی پر لٹک رہا تھا۔ اور اس کے قریب ہی اس کا لمبا بادامی رنگ کا کوٹ ایک کسمپرسی کی حالت میں جھولتا رہتا —— اور وہ سوچتی تھی کہ

آخر اس نے تو کسی کا کچھ نہیں بگاڑا تھا۔ پھر کس کی نگاہیں اس بیدردی سے اسے کھاتی جا رہی تھیں۔ کتنے صبر سے وہ اپنے بچوں کی موت کے متواتر صدمے برداشت کر رہی تھی۔ لیکن یہ آخری وار کتنا ہولناک پڑنے والا تھا۔ وہ پتھر کی ایک بے جان چٹان کی طرح لگتی۔ اس کے چہرے کی سیاہ جلد پر انتہائی غم کی تاریکیاں اس طرح چھا گئی تھیں جیسے گھنگھور بدلیاں کسی آتش فشاں چٹان کو ہر طرف سے ڈھانپ لیں۔ اس کے رخساروں پر ایک گہرا سکوت چھا گیا تھا۔ اور اس کی پر اضطراب آنکھوں میں ایک عجیب غیر معمولی چمک آ گئی تھی ـــــ باغیانہ اور سرکش چمک ـــــ!

وہ اپنے بچوں تک سے بے پروا ہو گئی تھی۔ سارا سارا دن گزر جاتا اور وہ خاموش رہتی۔ جیسے اس کی زبان پر تالا لگ گیا ہو ـــــ! کھانسی کی تیز اور تکلیف دہ آواز سن کر وہ اپنے کانوں کو دونوں ہاتھوں سے بند کر لیتی۔ اور اس کی لرزتی ہوئی پتلیاں آسمان پر جم جاتیں اتنی تیز تیکھی اور سرکش نگاہوں سے وہ اسے گھورتی رہتی۔ اذان کی لہراتی ہوئی آواز سن کر اس کے کانپتے ہوئے ہاتھ اچانک سر سے گرے ہوئے آنچل کی طرف اٹھ جاتے۔ مگر وہ اپنے ہاتھوں کو زور سے جھٹک دیتی۔ روز اسی طرح سر کھولے ہوئے وہ ایک فاتحانہ سربلندی کے ساتھ بے پردا بیٹھی رہتی ـــــ جب اس کا دل زیادہ بے چین

ہوتا، اور اس کے شوہر کی تکلیف بڑھ جاتی تو اس کا چولہا ٹھنڈا پڑا رہتا اور اس کے بچے اسی طرح بھوکے سو جاتے۔ لیکن وہ بیجان مورت کی طرح بیٹھی رہتی۔ آخر ایک دن کھانسی، بخار اور بیماری کی سب تکلیفیں ختم ہو گئیں۔ بیمار کے کمرے میں لوبان کے اٹھتے ہوئے دھوئیں پر ایک گہرا سکوت چھا رہا تھا۔ وہ اس کی آخری گھڑی میں اس کے پاس تھی۔ اس کی کھلی ہوئی آنکھوں کو اس نے اپنے ہاتھوں سے ہمیشہ کے لئے بند کر دیا تھا۔ اور اس کے سرہانے لوبان جلا کر وہ اسی جگہ بیہوش ہو کر گر گئی تھی ——! بچوں کی چیخ سن کر بستی کے سارے لوگ آ گئے تھے۔ اور اسے ہوش میں لانے کی ساری کوششیں بیکار ہو گئی تھیں۔ اس کی بیہوشی عجیب طرح کی تھی۔ چہرہ اور بھی گہرا سیاہ ہو گیا تھا۔ آنکھیں بھیانک طور پر باہر نکل آئی تھیں۔ زبان باہر لٹک رہی تھی، اور گردن، ہاتھ اور پاؤں اینٹھ کر سخت ہو گئے تھے —— وہ اسی طرح سارا دن اور ساری رات بیہوش پڑی رہی ——! اس کے ہاتھ کی چوڑیاں توڑ دی گئی تھیں۔ اور سفید ساڑی میں اس کے چہرے کی زردی آمیز سیاہی کی چمک اور بھی ڈراؤنی ہو گئی تھی —— اس کے بچے ڈر سے اس کے پاس نہ جاتے —— اور جب اسے ہوش آیا تو وہ مجسم نفرت بن چکی تھی۔ اسے اپنے بچوں تک کی پروا نہ رہی تھی۔ ہمدردی کرنے والیوں کو وہ قہر آلود نظروں

سے گھورا کرتی ــــــ! اس کے رشتہ دار تعزیت کے لئے آئے تھے۔
اس کا بھائی بھی اپنی بیوی کو لے کر بچوں کی دیکھ بھال اور اس کی تنہائی کے
خیال سے آگیا تھا۔ اس کے بھائی کا کوئی بچہ نہ تھا۔ اور دونوں میاں بیوی
انہی بچوں کو اپنے سینوں سے لگا رہے تھے۔ جو محبت، جو پیار وہ ایک
عرصے سے اپنے بچوں کو نہ دے سکی تھی، وہی محبت اور وہی چاہت
اس کے بچوں کو دوسرے لوگوں سے مل رہی تھی۔ ..........

.................. اور اس طرح گویا اس کا آخری
سرمایہ بھی چھن رہا تھا۔ وہ اسے برداشت نہ کر سکی۔ زخمی عقاب کی طرح
جھپٹتی ہوئی وہ اپنے بچوں کو چھین لائی۔ اس کا اپنا سب کچھ لٹ چکا تھا۔
کسی کی ہمدردی پر اسے اعتبار نہ تھا۔ اس کے دماغ میں ایک جھلاہٹ
بسی تھی کہ ایسی مایوس اور نازک گھڑیوں میں اس کے بچوں کو بھی چھینا جا
رہا ہے۔ جب اس کی مصیبتوں میں کوئی کام نہ آیا تھا، اور کسی نے بات
تک نہ پوچھی تھی تو اب وہی لوگ گھر کا مشترکہ حصہ اور ساری چیزوں پر قبضہ
جمانے کیوں آگئے تھے۔ وہ ہر وقت ایک غضبناک شیرنی کی طرح حملہ آور
رہتی۔ بستی کی ملنے والیوں سے وہ ایسے ملتی ایسے بولتی اور انہیں اس
طرح گھورتی، جیسے انہی نے اس کی خوشیوں اور مسرتوں کو لوٹا ہو۔ بل
کھائے ہوئے سانپ کی طرح وہ ہر گھڑی اپنی زبان اور نگاہ سے لوگوں

کو ڈستی رہتی ——! اس کا بسا بسایا گھر جیسے ڈاکوؤں نے لوٹ لیا تھا۔ وہ ایک ایک چیز کی محتاج ہو گئی تھی، اب اس کے مٹکے خالی پڑے تھے۔ اور گھر بھر پر ایک بیکسی سی چھا گئی تھی۔ اس کے اپنے اور بچوں کے کپڑے پھٹتے جا رہے تھے۔ اسی گھر کے اندر وہ ایک ملکہ کی طرح رہتی تھی مگر اب اس کا تاج چھن چکا تھا۔ فاقے اور غم نے اسے بیحد چڑچڑا بنا دیا تھا۔ اور وہ اپنا سارا غصہ گھورتی ہوئی نگاہ، ڈنک مارتی ہوئی زبان اور بچوں کو مار مار کر نکالتی۔ دکھ اٹھا اٹھا کر بنائے ہوئے اس کے گھر میں اب دوسروں کے چراغ روشن تھے۔ اور وہ یہ روشنی دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔ ہمدردی کرنے والے بھائی اور بھاوج کو طعنے دے دے کر اس نے اپنے مقابلے پر ابھارا تھا۔ اب اس کے لئے کوئی آنکھ پرُنم نہ ہوتی، کسی کے دل میں غمگساری کا جذبہ نہیں تھا ——! اس کی باغی روح فطرت سے ایک ہولناک جنگ کرنے کی آرزومند تھی۔ مگر اس کی تیکھی اور سرکش نگاہوں کو دیکھتے ہوئے بھی آسمان خاموش تھا۔ پھر وہ کیا کرتی —— اور یہ لڑائی روز روز کے جھگڑے، طعنے اور کوسنے تو اس کی بے بسی اور مجبوریوں کے نشان تھے۔ کمزور اور بے بس مریض انتہائی غصہ میں سوائے اپنا منہ نوچنے کے اور کیا کر لیتا ہے ——!

آخر اسے اس گھر سے نفرت ہو گئی۔ اس محبوب گھر سے، جس کے گوشے

گوشے سے اس کے شوہر کی یاد لپٹی ہوئی تھی، جہاں اس کے شوہر کا چھاتا، کوٹ، کمبل اور جوتے رکھے ہوئے تھے۔ انہی چھپروں کے نیچے سے اسی اندھیری اندھیری کوٹھڑی میں اس کے کتنے پھول سے بچے کھو گئے تھے۔ دس بچے انہی تاریکیوں میں ڈوبتے چلے گئے تھے۔ اور وہ انہیں بے بسی سے دیکھتی رہی تھی۔ مگر اب جبکہ محبت و پیار۔ کا سرچشمہ ہی سوکھ گیا تھا۔ تو پھر اس کی ترسی ہوئی روح کو کون سیراب کرتا۔ ایک دم اس کا سارا غم تازہ ہو گیا تھا۔ لیکن ایسے وقت میں بھی اسے وہ پہلی سی تسلّی دینے والا کوئی نہیں تھا —— !

وہ اپنے تصور میں کیسے کیسے جالے بنتی رہی تھی۔ طوفان کے کتنے جھکّڑ آئے۔ مگر اس کے پاؤں صرف ڈگمگا کر ہی رہ گئے تھے لیکن اس بے پناہ آندھی نے اس کے گھونسلے ہی کو اجاڑ کر پھینک دیا تھا مکڑی کے جالے آخر جالے ہی تھے نا ؟ کب تک وہ اسی طرح جھولتے رہتے —— !

کبھی اس نے اپنے وقار، اپنی عزت کی خاطر گھر کی نئی دیواریں اٹھائی تھیں۔ اور اب وہی دیوار پرانی ہو ہو کر اس پر گرتی جا رہی تھی۔ —— خود اپنے گھر میں راہی بن کر اس سے نہ رہا گیا۔ آخر غم و غصہ اور مسلسل فاقے سے تنگ آ کر وہ اپنے دونوں بچوں کو کرایہ کی بیل گاڑی

پر سوار کر کے قریب ہی دوسرے گاؤں میں نوکری کرنے چلی گئی — اور اس کے گھر میں — ساری بستی میں جیسے امن ہو گیا —

تین مہینے کے بعد ایک شام کے دھندلکے میں پردہ لگی ہوئی ایک بیل گاڑی میں وہ پھر اپنے گھر آ رہی تھی۔ گاڑی کے پیچھے پیچھے اس کا لڑکا اپنی چھوٹی بہن کو گود میں لئے آ رہا تھا — وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا — "اماں! اماں! اماں!"۔ گاڑی دیکھتے ہی بستی کی عورتیں بھی آ گئیں۔ وہ سب کی سب دروازے کی طرف دوڑیں۔ وہ گاڑی کے اندر بے ہوش پڑی تھی —

— لحاف میں لپٹی ہوئی، بے ہوش، نیم مردہ — اسے گاڑی سے اتار کر اسارے کے پلنگ پر لٹا دیا گیا۔ اس کے منہ سے لحاف ہٹا کر جب پانی کے چھینٹے دیئے جانے لگے۔ تو لالٹین کی روشنی میں لوگوں نے بڑی حیرت سے دیکھا کہ وہ موٹے موٹے چیچک کے دانوں سے داغی ہوئی تھی۔ اس کا زخموں سے بھرا ہوا سیاہ چہرہ پھول کر ہیبت ناک ہو گیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس نے انتہائی تکلیف میں ان زخموں کو جگہ جگہ سے نوچ دیا تھا۔ کھال ادھڑ گئی تھی، اور اندر سے لال لال گوشت انگاروں کی طرح دہک رہا تھا۔ اس کی کھلی ہوئی آنکھیں پتھرائی ہوئی تھیں۔ اور وہ ایک کچے

دھاگے کی طرح ــــــ نہ جانے کب کی ٹوٹ چکی تھی ؛

# سُہاگ

اُسے دُھندلا دُھندلا سا یاد تھا۔ کہ اُس کی ماں اُسے اپنے ساتھ ایک دوسرے گاؤں میں لے گئی تھی اور پھر وہاں کے بستی والوں نے ایک شریف مگر دونوں آنکھوں سے اندھے مؤذن کے ساتھ اُس کی ماں کی شادی کرادی تھی۔ اُس کے بعد ایک چھوٹا سا تاریک گھر اور گھر کا مختصر سا سامان سب کچھ اُس کی ماں کا تھا۔ مکان کے پیچھے ریت کے پہاڑ اٹے ہوئے تھے۔ اور وہ اسی ریت کے ٹیلے پر بستی کی اور لڑکیوں کے ساتھ مل جل کر کھیلا کرتی تھی۔ کئی دنوں تک تو اُس کا جی اس اندھیرے گھر اور اس نئی بستی میں نہ لگا مگر رفتہ رفتہ وہ اس کی عادی ہوتی گئی۔ پہلے پہل اُس کو اندھے مؤذن سے بہت ڈر لگتا تھا۔ مگر جلد ہی وہ اس سے اتنی مانوس ہو گئی کہ مسجد سے اذان کی آواز سنتے ہی دروازے کی

طرف دیکھتی رہتی کہ اب اُس کا باپ آ رہا ہے۔ اور سچ مچ وُہ اُس کو باپ ہی کی طرح پیار بھی کرتا تھا۔ مسجد سے آتے ہوئے وُہ کبھی میلاد کی مٹھائی اور کبھی نکاح کا نُقل اور چھوارے لالا کر اُس کو کھلاتا۔ تھوڑی مُدت کے بعد اُس کو اسی کی طرح ایک خوبصورت سی بہن مل گئی۔ دونوں بہنیں ایک شکل کی تھیں۔ دُبلی پتلی نازک سی چینی کی سفید، ایک بڑی اور ایک چھوٹی گڑیا۔ جو اس چھوٹے سے تاریک گھر میں چمکتی رہتیں۔ اُس کی ماں وُہ اور اُس کی بہن تینوں کی صورت ایک جیسی تھی۔ اُس کی طرح چھوٹی بہن ریت پر کھیلنے لگی تھی۔ جب ذرا بڑی ہو کر ماں کے کاموں میں کچھ مدد دینے کے قابل ہوئی تو اُس کی ماں مر گئی، پہلی بار اُس نے موت کو دیکھا اور اُس کی تلخیوں کو سمجھا تھا۔ اس کے بعد گھر کی اُداسی بہت بڑھ گئی سناٹا ہر طرف چھایا رہتا۔ غنیمت تھا کہ بستی کے سارے مکان قریب قریب ایک دوسرے سے ملے ہوئے تھے۔ وُہ اپنی بہن کو گود میں لئے گھر گھر گھومتی پھرتی۔ دونوں بہنیں ناف سے اوپر چھوٹا سا میلا کُرتا پہنے رہتیں۔ اور اُن کی سُوکھی سُوکھی ٹانگوں میں ایک اُٹنگ سا پاجامہ چمٹا رہتا تھا۔ اُس کو اپنے گھر سے ایک وحشت سی ہو گئی تھی۔ اُس کے دل و دماغ پر یہ بات جم کر رہ گئی تھی کہ گھر کے اسی اندھیرے میں اُس کی ماں اُس سے بچھڑ گئی ہے۔ سارا سارا دن وُہ گھوم گھام کر کسی کے یہاں کھا پی کر گزار دیتی۔ مگر راتیں اُس کو بڑی ڈراؤنی نظر آتیں۔ وُہ نیند سے چونک چونک کر اپنی سوکھی ہوئی پسلیوں سے اپنی بہن کو چمٹا لیتی کہ کوئی اُسے بھی اُس سے نہ چھین لے۔

اندھا باپ کبھی کبھی اُن کی اُنگلیاں تھامے بازار گھما لاتا اور اُنہیں بہلانے کیلئے اکثر میلے اور عرس کا تماشا دکھایا کرتا تھا۔ اس بیچارے کی زندگی بھی اُجاڑ ہو گئی تھی۔ وقتی طور پر فطرت نے اُسے ذرا سا خوش کیا تھا۔ مگر ایسی خوشی جس کے بعد اُس کی دائمی

خلش اور چبھن اس سے کبھی نہ دور ہو سکی۔ اس کے لئے پہلی ہی زندگی اچھی تھی۔ آزاد خوش اور بے فکر مگر اب ایک لمحہ کی مسکراہٹ نے اُسے ہمیشہ کے لئے زندگی کی تلخیوں سے ہمکنار کر دیا تھا۔ وہ دونوں وقت خود چُولھا جلاتا۔ اُس کی بڑی بیٹی کچھ مدد کرتی اور وہ جیسے تیسے کچا پکا کھانا دیا کرتا ——— صغریٰ اور کبریٰ دونوں بہنیں اپنے اندھے باپ کے ساتھ گنجان بستی کے اندر بڑھتی گئیں۔ اُن کے سروں پر اب چھوٹے دوپٹے ڈال دیئے گئے تھے۔ اور وہ دونوں بہنیں ایک دوسرے سے مل کر بڑے پیار اور محبت کے ساتھ رہتیں۔ ماں کا غم اور روز روز کی پریشانیاں بھولتی جا رہی تھیں۔

آخر سماج کے ہاتھوں نے اُنہیں ایک دوسرے سے جُدا کر دیا۔ صغریٰ بارہ ہی سال کی تھی کہ بستی کے لوگوں نے چندہ جمع کر کے اندھے موذن کے کندھے کا بار ہلکا کر دیا۔ اس کی شادی قریب ہی ایک دوسرے گاؤں میں کر دی گئی تھی۔ مگر اس کے سسرال والے کئی سال سے اپنے سارے خاندان کے ساتھ اب رنگون میں جا بسے تھے۔ اور دو تین سال کے بعد کبھی کبھی اپنا گھر بار دیکھنے آجاتے تھے۔ اس دفعہ بھی سارا خاندان عید منانے گھر آیا ہوا تھا کہ صغرا اُن کے گھر بیاہ دی گئی۔ شادی کے بعد جلد ہی اُسے رنگون جانا تھا۔ وہ جانے سے پہلے اپنی بہن اور باپ کو ملنے کو آئی۔ ایک طویل جدائی کے خیال نے انہیں بہت حساس اور مضطرب بنا دیا تھا۔ وہ اپنی بہن کے اُداس اور غم سے نڈھال چہرے کو اپنے سینے سے لگا کر بہت روئی اُس کے باپ کی آنکھوں کے گڑھے سے بھی آنسوؤں کے چند قطرے ٹپک پڑے۔ اس بیچارے نے پال پوس کر بھی کبھی نہ دیکھا تھا۔ اور نہ کبھی دیکھ ہی سکتا تھا۔ پھر بھی ایک لمبی جدائی کا اُسے غم تھا۔ وہ اُس کو تو نہیں مگر اُس کی آواز اور لمس کو محسوس کر سکتا تھا۔ آخر بہت سے پیار۔ محبت۔ آنسوؤں اور دعاؤں کے ساتھ

وُہ اپنے باپ اپنی پیاری بہن اور اپنی ریت کے ٹیلوں والی بستی سے بہت دُور سمندر پار رنگون جارہی تھی ——— چلتی ہوئی لاری میں سے دور تک وُہ اپنا گاؤں دیکھتی رہی۔ شیشم اور نیم کے جھنڈ نہر کا اونچا بند اور ریتلی زمین اُسے بہت دُور تک دکھائی دیتی رہی۔ اور جب سب کچھ اُس کی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا تو بہت محبّت سے وُہ لاری کے پیچھے چھٹتی ہوئی اُس لمبی سڑک کو دیکھتی رہی جو اُس کے ہرے بھرے شاداب گاؤں کو جاتی تھی۔ اور دو ہی گھنٹے کے بعد یہی لاری مسافروں سے بھری ہوئی اُسی محبوب سمت کو اسی تیزی سے دوڑی ہوئی جائے گی۔ مگر وُہ اس میں نہ ہوگی۔ اُس کی نگاہوں میں اندھی آنکھوں کے دو آنسو بھرے گڑھے اور ایک خوبصورت سا غمگین اُترا ہوا چہرا رہ رہ کر گھوم رہا تھا۔ اُس نے اپنے آگے کھچے ہوئے گھونگھٹ کی آڑ میں آنسوؤں کو پونچھ لیا۔ یک بیک اُسے محسوس ہوا کہ وُہ تنہا نہیں ہے۔ اُس کی ساس اور نندیں اُس سے لگی بیٹھی ہوئی ہیں۔ اور پردے کے آگے اُس کا سُسر اور شوہر بھی موجود ہے۔ اتنے لوگوں میں بھی اُس کا دل کتنی تنہائی محسوس کر رہا تھا۔ صغریٰ نے جیسے ہی اپنے چہرے پر سے آنچل کو ذرا سرکایا اُس کی نظر آگے بیٹھے ہوئے اپنے شوہر پر پڑی مسرت کی ایک لہر اُس کی رگ رگ میں دوڑ گئی۔ وُہ اس کا شوہر تھا۔ جس سے وُہ بہت سی باتیں کہہ سکتی تھی اور جس نے اس سے بہت سی باتیں کہی تھیں۔ وُہ اسی کے گھر تو جارہی تھی۔ اُس کے اپنے گھر میں ایک اندھے باپ اور بہن کے سوا اور کون تھا۔ اور اب وُہ ایک بھرے ہوئے گھر میں آرام سے رہے گی ——— "رنگون" ——— "رنگون" ——— یہ نام اُس کے لئے بہت پُرانا تھا۔ اور بچپن ہی سے وُہ جانتی تھی کہ یہ نام بہت ہی اچھا ہے۔ وُہ اپنی بستی کے اندر بہت سے گھروں میں رنگون سے آئے ہوئے رنگ دار بسکٹوں پنکھوں کے پیکٹ طرح

طرح کے سلیپر اور رنگ برنگ کے کپڑے دیکھتی رہتی تھی اور ان ساری چیزوں کو دیکھ دیکھ کر اُس کا جی بھی چاہتا تھا کہ کوئی اُس کا بھی رنگون میں رہتا۔ اور اتنی چیزیں اُسے بھی آتی رہتیں اور اب وُہ خود اسی رنگون میں جا رہی تھی۔ رنگ وار بسکٹوں پنکھجوروں ناریل کے تیل اور رنگا رنگ کپڑوں والے شہر میں اُس نے مسکرانے کی کوشش کی۔ مگر وُہ جھینپ گئی، ڈرائیور کے رانگ سائیڈ میں بیٹھا ہوا اُس کا شوہر موٹر کے آئینہ میں اُسے تک رہا تھا۔ اُس کی تکتی ہوئی نگاہوں کو دیکھتے ہی اُسے اُس کی بہت سی باتیں یاد آنے لگیں۔ پہلی بار اُسی کے مُنہ سے اُس نے اپنے کو خوب صورت ہی نہیں بلکہ حسین سمجھا تھا اور اس سے پہلے یا تو اُسے اپنے کو خوبصورت سمجھنے کا شعور نہ تھا یا کہنے والے اتنے پُریقین طور پر اُسے حسین نہ کہہ سکے تھے کبھی کبھی تو آئینے کی تھوڑی سی نظر آ جانے والی جھلک بھی اُس کے شوہر کی طرح اُس کی آنکھیں اور لب و رخسار کی حقیقت اُسے نہ بتا سکتی تھیں۔ وُہ بہت جلد اپنا اُداس اور سونا گھر بھولنے لگ گئی۔ جب وُہ لاری سے اُتر کر ریل پر سوار ہوئی تو ایک بار پھر اُس کی آنکھیں اُبل پڑیں اُس نے مسرّت سے اپنے گاؤں کو جانے والی اُس لاری کو دیکھا جس پر اُس کی بستی کے جانے والے مسافر سوار ہو رہے تھے۔ وُہ زندگی میں پہلی بار موٹر پر سوار ہوئی تھی۔ اور ریل کا سفر کرنے والی تھی۔ جیسے ہی ریل سیٹی دے کر چلی وُہ اپنی جگہ سے اُچھل پڑی۔ گاڑی چلتی رہی۔ اور بہت دیر تک اُس کا سر گھومتا رہا۔ اُس کی ساس اور نندیں بہت محبت سے اُس کا خیال کر رہی تھیں۔ پہلی بہو اُن کے گھر جا رہی تھی اور وُہ بھی اتنی اچھی سی بہو!

صغریٰ کے لئے اسٹیشنوں کے ہنگامے بالکل نئے تھے۔ رنگ برنگ کی بکتی

ہوئی چیزوں کو دیکھ کر اُس کا جی للچا رہا تھا۔ طرح طرح کی مٹھائیاں، قسم قسم کے کھلونے اور خوبصورت چوڑیاں۔ اُس کا جی چاہتا تھا کہ ان ساری چیزوں کو مول لے لے۔ مگر وُہ شرم سے ایسا نہ کر سکی —— پہلے پہل ایک ہی سفر میں اس نے لاری ریل اور جہاز سب کچھ دیکھ لیا۔ اتھاہ سمندر سے گزرتے ہوئے اُس نے محسوس کیا کہ وُہ دُنیا کے آخری کناروں تک چلی آئی ہے۔ سمندر کے وسیع پھیلے ہوئے پانیوں کے پیچھے بھلا اب اور کیا ہو سکتا تھا۔

پھر وُہ رنگوں میں جیسے بس کر رہ گئی۔ وُہ یہاں سے کہیں نہ جا سکی۔ کبھی کبھی اکیلا اس کا سُسرا اپنا گھر بار جا کر دیکھ آتا تھا۔ اسی سے صغرےٰ کو اپنے گھر کی بھی خبر مل جاتی تھی۔ زمانہ جیسے جیسے گزرتا جا رہا تھا۔ اُس کی نگاہوں میں پہلے نقوش دھندلے ہوتے جا رہے تھے۔ بس وُہ اتنا ہی سوچتی کہ اُس کا باپ اب بڈھا ہو گیا ہو گا۔ اور اُس کی بہن اب اتنی بڑی ہوئی ہو گی —— اتنے عرصے میں اب وُہ ایک سمجھدار عورت ہو گئی تھی۔ اور اُس نے سمجھ لیا تھا۔ کہ رنگون صرف کپڑے اور کھلونوں ہی کا شہر نہیں ہے۔ اُس کی زندگی مطمئن تھی۔ اُس کا سُسر ٹوپیوں کی دوکان کرتا تھا۔ اور اُس کا شوہر دفتر میں کسی معمولی سے کام میں لگا ہوا تھا۔ اُس کے ہاں کئی بچے پیدا ہوئے۔ جس میں صرف تین زندہ تھے۔ اُسے اپنے بچوں کی موت بہت شاق گزری تھی۔ ماں کی موت سے بھی کہیں زیادہ —— اور اب جو تین بچے اس کے پاس رہ گئے تھے۔ وُہ گھر بھر کو عزیز تھے اُس کا شوہر خوبصورت نہ تھا۔ پھر بھی وُہ اُسے بہت پسند تھا۔ وُہ بہت محبّت سے اُس کا کام کرتی اور اُس کے آرام کا خیال رکھا کرتی تھی۔ اُس نے گھر کے کسی آدمی کو کبھی شکایت کا موقع نہ دیا۔ —— شیشم کے بھنڈ والا گاؤں اب اس کو کبھی

کبھی یاد آتا اور وہ رنگون کے شاندار پگوڈوں خوبصورت بازاروں اور وسیع عمارتوں میں اُسے بھول گئی تھی ــــــ بارہ سال کا ایک طویل زمانہ اُس نے یہیں گزار دیا تھا۔ زندگی کا بیشتر حصّہ وُہ اس خوبصورت شہر میں آرام سے گزار رہی تھی، اُس کی زندگی میں اب بہت سی چیزیں شامل ہو گئی تھیں۔ چائے کے بغیر اب اس کے سر میں درد ہو جاتا تھا۔ وُہ گھر سے باہر رکشے ہی پر جایا کرتی تھی۔ اور سینما کے تماشوں نے اب اس کی آنکھوں کو کھول دیا تھا۔ ایک ہی ہموار مگر رنگا رنگ رستے پر۔ اُس کی زندگی بڑے چین سے گزر رہی تھی کہ اچانک جنگ کی گرانی نے اس کی دنیا میں تھوڑی سی پریشانی پیدا کر دی لیکن یہ تردد بھی کچھ زیادہ نہ تھا کہ اُس کا سکون ختم ہو جاتا۔ مگر تھوڑے دنوں سے جنگ کی ہولناک خبروں نے سارے شہر اور اُس کے گھر بھر کو بے چین کر رکھا تھا۔ وُہ ابھی تک جنگ کو دُور کی چیز اور بس چیزیں نہ ملنے کی وجہ سے پریشانی کی ایک صورت سمجھے ہوئے تھی۔ باقی ان ہولناک خبروں کو کہ جاپانی بڑھے چلے آ رہے ہیں۔ صرف ایک انہونی سی بات سمجھتی تھی "بنکاک" کے حملے کی خبر سے بھی وُہ پریشان نہ ہوئی اُس نے صرف رنگون دیکھا تھا۔ اور "بنکاک" کی دنیا کو اپنے آپ سے بہت دور سمجھے ہوئے تھی۔ یک بیک ہوائی خطرے کا الارم سُن کر سارا شہر لرز اٹھا جیسے ایک قیامت آ گئی ہو۔ طوفان کی طرح ایک بھاگڑ مچ گئی شہر کے لوگ کچھ تو جھیل کے کنارے پناہ لینے چلے گئے۔ اور کچھ زمین کے نیچے ٹرنچوں میں دبک گئے تھے۔ اپنے گھر والوں کے ساتھ وُہ بھی بھاگی۔ وُہ بھاگنا نہ چاہتی تھی۔ اس کی سمجھ میں یہ بات نہ آتی تھی کہ صرف الارم کی کان پھاڑ دینے والی آواز سے جاپانی کیسے آ جائیں گے۔ وُہ یہی سوچ سوچ کر پریشان ہو رہی تھی کہ یکبارگی سارا شہر گھنگھناہٹوں سے گونج

اُٹھا اور اس کے بعد ـــــ زمین اتنے زور سے تڑخنے اور ہلنے لگی جیسے کوئی اُس کی بنیادوں کو اُٹھا کر پھینک رہا ہو۔ ہیبتناک تڑاخوں سے کان کے پردے پھٹ پھٹ گئے۔ اُس کا سارا جسم تھر تھر کانپ رہا تھا۔ صغرٰے کے دانت ایک دوسرے پر بجنے لگے۔ پھر اُسے کچھ یاد نہ رہا کہ کیا اور کیسے ہوُا ـــــــ جب وُہ گھر جانے لگی تو سارا شہر سنسان پڑا تھا۔ شہر کی بہت سی عمارتیں اس طرح مسمار ہو گئی تھیں۔ کہ اُنہیں پہچاننا بھی مشکل تھا۔ مگر اُس کا چھوٹا سا گھر محفوظ رہ گیا تھا۔ پھر یہی ہونے لگا کہ خطرے کا الارم بجتا۔ لوگ بھاگتے اور اپنے دانتوں کے نیچے ربڑ دبا کر ٹرنچوں کے اندر اور جھیل کے کنارے بیٹھ جاتے۔ پھر بھی کافی لوگ ہلاک ہو رہے تھے۔ موت کی گھٹا جیسے ہر طرف سے شہر پر چھا گئی تھی۔ اور لوگ پٹ پٹ مر رہے تھے۔ سارا شہر خالی کیا جانے لگا۔ جو بھی شہر سے نکلنے لگتا وُہ سمجھتا تھا۔ کہ زندگی کی طرف بھاگا جا رہا ہے اور وُہ اپنے پیچھے رہ جانے والوں کو حسرت سے دیکھتا کہ ہر لمحہ اُن کے سروں پر موت منڈلا رہی ہے۔ موت کی ہیبتناکی سارے شہر پر برس رہی تھی کوئی نہیں جانتا تھا کہ کل تک زندہ بچے گا یا نہیں۔ صغرٰے کے گھر والے بھی رنگون سے بھاگنے کو تیار ہوئے۔ مگر سواری کا ملنا آسان نہ تھا۔ بیل گاڑی والے تک حد سے زیادہ کرایہ مانگ رہے تھے۔ اور اس پر بھی گاڑیوں کی قلت ہی تھی۔ مگر اتنے بڑے خاندان کو اس طرح ہلاکت کے منہ میں چھوڑا بھی نہ جاتا تھا۔ اُس کے سسر اور شوہر نے بڑی مشکلوں سے ایک بیل گاڑی ٹھیک کی۔ اتنے برس کا اپنایا ہوُا گھر کی اتنی چیزوں کو چھوڑتے ہوئے اُسے بہت غم ہو رہا تھا۔ بہت تھوڑی سی چیزیں ساتھ جا سکتی تھیں۔ چیزوں کو کون پوچھتا۔ اُس وقت جان بچانا ہی دشوار ہو رہا

تھا۔ جب سارے لوگ سوار ہو رہے تھے تو صغریٰ نے پُر اشتیاق نظروں سے اپنے شوہر کو دیکھا جو سب کو سوار کرا رہا تھا۔ صغریٰ نے سوچا کہ وہ اپنے شوہر کے ساتھ جنگل میں بھی خوشی سے رہنے کو تیار ہے اور یہ تو ایک وقتی پریشانی تھی۔ زمین پر دھری ہوئی ڈھلوان بیل گاڑی کو جب گاڑیبان بیل کے کندھوں پر دھرنے لگا تو اُس نے بےچین نظروں سے گاڑی کے آگے کی طرف دیکھا وہاں اُس کا سُسر نندوئی اور دونوں دیور بیٹھے ہوئے تھے۔ اُس کا شوہر گاڑی پر نہ تھا۔ وہ اُس کے پاس ہی زمین پر کھڑا تھا —— لوگوں کے چہرے غم سے اُترے ہوئے تھے۔ مگر اُس کے شوہر کی آنکھ میں آنسو بھی تیر رہے تھے۔ اُس کا چہرہ تمتمایا ہوا تھا اور یوں لگ رہا تھا جیسے وہ بہت مشکلوں سے اپنی چیخ کو روکے ہوئے ہے۔ سب سے ملتا ہوا وہ آخری بار صغریٰ کے پاس آیا —— اور اپنے سب سے چھوٹے بیٹے کو پیار کرتے ہوئے رُک رُک کر بولا —— تم لوگ ابھی چلے جاؤ۔ ساری چیزوں کا انتظام کر کے ہم دوسری گاڑی سے آکر جلد ہی تم لوگوں سے مل جائیں گے ——

صغریٰ کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اُس کو پہلی بار معلوم ہوا کہ وہ ساتھ نہیں جا رہا ہے۔ اتنی تھوڑی دیر کی جدائی بھی وہ برداشت نہ کر سکتی تھی۔ وہ زور زور سے رونے لگی۔ ایسی پریشان گھڑی میں چلتے وقت رونے کی یہ منحوس بدشگونی اُس کے سُسرال والوں کو بہت بری لگی۔ وہ سختی سے اُسے منع کرنے لگے۔ پھر بات ہی کتنی دیر کی تھی۔ دوسری گاڑی بارہ بجے رات کو یہاں سے چلنے والی تھی۔ یہ لوگ پہلے سے جاکر اپنی گاڑی کو آگے لے جاکے روک لیں گے۔ جب وہ دوسری گاڑی سے آجائے گا تو پھر سب مل کر ایک ساتھ آگے بڑھیں گے۔ گاڑیبان نے

ہٹ ہٹ کر کہا بیل کے قدم آگے بڑھنے لگے۔ اور آہستہ آہستہ پہیے کا بڑا چکر گھومنے لگا۔ اُس وقت صغرےٰ کی نگاہوں میں سارے رنگوں کے ساتھ سارا آسمان اور ساری زمین گھومتی ہوئی نظر آرہی تھی، چلتی ہوئی گاڑی سے کود جانے کو اُس کا دل چاہ رہا تھا۔ مگر وہ سسرال والوں کے خوف و شرم کے ملے ہوئے احساس سے ایسا نہ کر سکی۔ گاڑی آگے جارہی تھی اور اُس کا دل پیچھے کی طرف اُڑا جا رہا تھا۔ اُس کی آنکھوں سے آنسو گر رہے تھے۔ مگر وہ انہیں جلدی جلدی آنچل میں پونچھ کر اُسی محبوب صورت کو دیکھ رہی تھی جو لمحہ بہ لمحہ اُس سے دُور ہوتی جارہی تھی۔ زندگی میں اُس کا یہ دوسرا سفر تھا۔ جب وُہ پہلی بار آئی تھی۔ تب بھی پیچھے ہی کو تکتی ہوئی آئی تھی۔ مگر اب تو اُس کی رُوح اس کی ساری دُنیا اور اُس کی ساری مسرت پیچھے چھوٹ رہی تھی۔ گاڑی بہت آگے بڑھتی چلی گئی۔ اور پیچھے اُس کی نگاہوں کے سامنے ایک دھندلکا سا چھاتا گیا۔ مگر یہ دھندلکا بھی اُسے عزیز تھا اور وہ اُسے بھی بہت محبت سے دیکھ رہی تھی۔ جس کے پیچھے اُس کا محبوب شوہر تھا۔ گاڑی چلتی رہی اور اُس کی نگاہیں اُسی ایک طرف جمی رہیں۔ جب بہت دیر ہو گئی اور وُہ تھک کر چُور ہو گئی تو بیل گاڑی کے موٹے بانس کو پکڑے ہوئے وُہ اُس پر ٹِک کر سو رہی۔ ساری رات گاڑی اسی طرح چلتی رہی ہر ہر قدم پر خطرہ ہوتا تھا۔ کہ کہیں کوئی بم نہ آگرے۔ دسمبر کی کڑاکے کی سردی سے سب کے دانت بجنے لگے تھے۔ دوسرے دن دوپہر کو ایک پڑاؤ پر گاڑی روک دی گئی۔ بہت سے مسافر وہاں پہلے سے موجود تھے۔ ایک بڑا اضطراب ہنگامہ ہر طرف مچا ہوا تھا۔ بمباری کے ساتھ ساتھ بھاگتے ہوئے مسافروں پر، جنگلوں سے گزرتے ہوئے برمی حملے

کر رہے تھے۔ لوگ ٹولیاں بنا بنا کر ایک گروہ کی صورت میں جاتے تھے کہ بر میوں سے محفوظ رہ سکیں۔ کھانے پینے سے بے خبر صغرٰے کی نگاہیں بس راستے ہی کی طرف لگی ہوئی تھیں کہ کب وہ دوسری گاڑی یہاں پہنچے گی۔ سارا دن گزر گیا۔ بہت سی سواریاں اگلی منزل کی طرف روانہ ہو گئیں۔ بھری ہوئی لاریاں مسافروں کو لالا کر اسی پڑاؤ پر اگلتی جا رہی تھیں۔ سواریوں پر بھر بھر کے مسافر آ رہے تھے۔ اور اس بیل گاڑی کے مسافر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اتنی بھیڑ میں ایک چہرے کو ڈھونڈ رہے تھے۔ انتظار ختم ہو کر اب اضطراب کی صورت اختیار کر چکا تھا۔ ساری رات اسی طرح بےچینی میں گزری، تیسرے دن جب انتظار کی آخری حد ختم ہو چکی تو وہ لوگ رو پڑے، گاڑی اسی طرح زمین پر ٹکی ہوئی تھی۔ کبھی کبھی اُنہیں واپس چلے جانے کا خیال ہوتا۔ مگر ساتھ ہی یہ خیال بھی ہوتا کہ اگر وہ ادھر سے جائیں اور وہ اُس طرف سے یہاں آ جائے تو پھر کیا فائدہ ہو گا۔ اور وہ کوئی بچہ تو نہیں تھا جو کھو جاتا کسی طرح وہ خود آ ہی جائے گا۔ گاڑی والا شور مچانے لگا اور پھر اُنہیں تنہا رہ جانے کا خوف بھی تھا۔ گاڑی آخرکار آگے بڑھائی گئی اور صغرٰے ایک لٹا ہوا دل لیے ہچکولے کھاتی اپنے شوہر سے دور، اور دور ہوتی چلی جا رہی تھی۔ طرح طرح کے خیالات اُس کے دل و دماغ پر چھا رہے تھے۔ کبھی کبھی اُس کا جی چاہتا کہ گاڑی پر بیٹھے ہوئے سارے لوگوں کو دھکیل کر نیچے گرا دے یہ لوگ کتنے آرام سے بیٹھے باتیں کرتے چلے جا رہے تھے ایک وہی بیچارہ گھر سے فاصل تھا۔ اگر یہ بوڑھا سُسر ہی چیزوں کی دیکھ بھال کے لئے چلا جاتا تو کیا ہرج تھا۔ اپنی ساس کی آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسوؤں کو دیکھ کر اُسے بڑا غصہ آ رہا تھا۔ "بڑا چیزوں اور گھر کا انتظام

ہو رہا تھا! ـــــ اُن لوگوں کو کیا معلوم کہ کسی کی ساری دُنیا اُسی کے دم سے وابستہ تھی "۔ دو دو بیٹوں کو سامنے بٹھائے اُسے کسی کے شوہر کی کتنی پروا ہو سکتی تھی؟ مگر اُس کا شوہر تو بس وہی ایک تھا نا۔ دن گزرتے گئے۔ اور وہ طرح طرح کی سواریوں پر سفر کرتے ہوئے اپنی منزل کی طرف آگے بڑھے جا رہے تھے۔ صغرے کی مضطرب نگاہیں اتنی بھیڑ میں اپنی پہچانی ہوئی اسی ایک عزیز ترین محبوب صورت کو ڈھونڈتی رہتیں۔ آخری بار اُس کی تھرتھرائی ہوئی آواز اُس کی رُوح میں بس کر رہ گئی۔ اور ہر گھڑی صغرے کی آنکھیں اُس کے لئے وقفِ انتظار ہو چکی تھیں۔ بعد میں آنے والے واقف کاروں سے اس کے شوہر کی خبریں پوچھی جاتیں۔ مگر ہر بار وہی لاعلمی کا اظہار ہوتا۔ اور رنگون کی حالت خطرناک سے خطرناک تر بتائی جاتی۔ آخر راستہ ہی میں یہ ہیبتناک خبر ملی کہ رنگون پر جاپانیوں کا قبضہ ہو چکا ہے۔ شہر کے اندر جاپانی بھیڑیے انسانی شکار کھیلتے پھر رہے ہیں اور شہر کے لوگ بھاگ بھاگ کر جنگلوں میں جا چھپے ہیں۔ صغرے کا دل لرز اُٹھا۔ جس کی تھوڑی سی تکلیف بھی وہ نہ دیکھ سکتی تھی۔ آج وہ کس طرح موت کے منہ میں ہراساں پھر رہا ہوگا۔ آخر یہ لٹا ہوا روتا دھوتا قافلہ مہینوں کے بعد اپنے گھر پہنچ گیا۔ صغرے کے آنسو اب خشک ہو چکے تھے۔ مگر اُس کا دل پہلے سے بھی زیادہ چیخ چیخ کر روتا رہتا تھا۔ جنگ کی خبریں بھیانک سے بھیانک تر ہوتی گئیں اور اُس کے ساتھ اُس کا دل بھی زور زور سے دھڑکتا رہا۔

اُس کی ساس اب سارا الزام اُسی پر دھرنے لگی تھی۔ چلتے وقت آنسوؤں کی بدشگونی کا ہی یہ سب شگوفہ تھا۔ یہاں آکر اُس نے ایک اور منحوس خبر سنی۔ کہ

اُس کی بہن شادی کے بعد چیچک سے مر گئی - اُس کو مرے ہوئے تھوڑے ہی دن گزرے تھے اور اب اس بستی والوں نے اس خوبصورت سی نازک اندام معصوم لڑکی کو ایک بھتنی اور چڑیل بنا دیا تھا - جو لوگوں کے سروں پر بھوت بن کر کھیلا کرتی تھی —— اُس کی محرومیوں نے اُسے بیحد چڑچڑا بنا دیا تھا - اور اُس پر روز روز کے طعنے اور کچوکوں سے وہ تنگ آ گئی تھی - آخر وہ بہن کی تعزیت کے بہانے سے اپنے باپ کے گھر آ گئی - بارہ سال کا بچھڑا ہوا اُس کا وہی پرانا رفیق گھر تھا جو اب اور زیادہ بوسیدہ ہو کر جگہ جگہ سے جھول گیا تھا - سب کچھ اس کا وہی اپنا جانا اور پہچانا ہوا تھا - لیکن چلتے وقت جس اُداس چہرے کو اُس نے اپنے سینے سے لگایا تھا - وہ ہمیشہ کے لئے اُس کی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا تھا -

—— وہ جی بھر کر روئی مردہ بہن اور زندہ شوہر دونوں کی جدائی کا اُسے شدید طور پر غم تھا - ماں سے لگے ہوئے اس کے تینوں بچّے بھی رو رہے تھے - جب آنسوؤں کا ایک سیلاب اُس کی آنکھوں سے بہہ گیا - تو اُس کا جی کچھ ہلکا ہوا - یہی گھر اُس کی پریشان حال ماں کا بھی سہارا بنا تھا اور اب یہی اُس کا بھی رفیق تھا - اُس کے باپ کو اُس سے اور اس کے بچّوں سے بہت محبت تھی - اتنے دنوں سے وہ اسی پیار کی بھوکی تھی - آخری بار اس کے شوہر کی محبت پاش نگاہیں اُس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں - جیسے وہ اُس سے کچھ کہنا چاہتا تھا - سال پر سال گزرتے گئے - اس کے سسرال والے خود آ کر بچّوں کو دیکھ جاتے تھے - وہ اپنے باپ کے پاس سے کہیں نہ گئی - اُس کے دل کو یہیں کچھ سکون ملا تھا اور وہ اسی اندھیرے گھر کی تنہائیوں میں اُمیدوں کے دیئے جلا سکتی تھی - سال پر سال گزرتے

گئے مگر اُس کو اپنے شوہر کی کوئی خبر نہ ملی۔ جیسے رنگون کے اتنے بڑے شہر میں وہ لوپ ہو گیا تھا۔ پھر بھی وُہ مایوس نہ ہوئی۔ جب اُس کا جی بہت گھبراتا تو فال نکلوایا کرتی۔ خوش فالی کے لئے وُہ گہرے گہرے رنگوں میں بڑے شوق سے اپنے کپڑے رنگ رنگ کر پہنتی۔ اُس کے ہاتھوں میں ہمیشہ شوخ شوخ رنگ کی چوڑیاں جھنجھناتی رہتی تھیں۔ وُہ اپنے کو لوگوں کے سامنے کبھی افسردہ نہیں دکھاتی تھی۔ اس کو اپنے شوہر کے قول کا اعتبار تھا۔ اور ہر روز اُس کی روح کو بیتابانہ طور پر ایک نئی اُمنگ اور ایک نئے حوصلے کے ساتھ اُس کا انتظار رہتا ــــــ اشادی بیاہ کی مجلسوں میں وُہ ہر بار وہی سُرخ ریشم کی ساڑی جس میں سفید چوڑے پٹھے لگے ہوئے تھے۔ بڑے شوق سے پہن لیتی۔ سارے مجمع میں اس کی ساڑی کا سُرخ رنگ دُور سے لپکتا اور گوٹے کے تار بجلی کی طرح چمکتے رہتے تھے۔ تین سال کے اتنے طویل عرصے میں اس بستی کے اندر کتنی ہی شادیاں ہوئیں اور وُہ ہمیشہ ہر ایک شادی میں اپنا وہی ایک عروسی جوڑا پہنے رہتی تھی۔ اب اُس کی ریشمی ساڑی کا رنگ بھی میلا ہو چکا تھا۔ اور گوٹے کے تار پھیکے پڑ کر، اپنی جگہ سے نکل نکل کر جھولنے لگے تھے۔ پھر بھی شادی کی مجلسوں میں اپنے آپ کو نمایاں طور پر سہاگن سمجھنے کے لئے وُہ ہر بار اپنا وہی سُہانا کپڑا پہن لیتی تھی۔ اس سے زیادہ شوخ رنگ کی اور کوئی دوسری ساڑی اُس کے پاس نہ تھی۔ اور اُس سُرخ رنگ کی ریشمی ساڑی اور اُس کے چمکتے ہوئے گوٹے سے اُسے شدید طور پر محبت تھی۔ وُہ خود تو مجمع میں بیٹھی رہتی۔ مگر اُس کی رُوح اُن عظیم الشان مگر شکستہ حال پگوڈوں والے شہر میں منڈلاتی ہوئی اپنے

سہاگ کو ڈھونڈھتی رہتی۔ شہنائی کی گونج اور گیتوں کی جھنکاریں اُس کے دل کی آگ کو اور تیز کر دیتی تھیں۔ اُس کی زندگی کی غمناکیوں میں اُس کے سکون کا سرمایہ بس یہی اُس کا ایک عروسی لباس ہی تو تھا۔ جو اُس کے سینے سے لگا ہوا اُس کو سہاگ کی تسلی دے کر ایک شیریں اور رنگین خواب دکھاتا تھا۔

# سُرخ بندی

ہوسٹل بھر میں وہ سب کی سب کل اکیس تھیں اور یہ ترقی بھی کہیں اب جا کر ہوئی تھی۔ نہیں تو اس سے پہلے وہ صرف آٹھ لڑکیاں تھیں جو ایک نیلے رنگ کی پرائیویٹ کوٹھی میں اوپر کی منزل پر رہتی تھیں، ان آٹھ لڑکیوں میں برجیس بھی تھی۔ اور اب پڑھائی کے آخری دور میں اُسے بھی ہوسٹل آجانا پڑا تھا۔ صرف پانچ سینئر لڑکیاں اب اس کی ساتھی رہ گئی تھیں باقی ساری لڑکیاں اس سے جونیئر تھیں۔ ہوسٹل سے قریب ہی ان کا کالج تھا اور اس کے سامنے اسپتال کی شاندار عمارتیں پھیلتی چلی گئی تھیں ——— ہوسٹل کی وسیع عمارت میں یہ بچاری اکیس لڑکیاں کچھ زیادہ رونق پیدا نہ کر سکی تھیں۔ وہ لکچر سننے کے بعد اپنے کاموں سے تھک کر چور واپس آتیں ——— پھر بھی ان کے اکثر کمروں سے دھیرے دھیرے نغموں کی آواز سنائی دیتی تھی۔ اور کبھی کبھی تو سارا ہوسٹل جیسے ایک میوزک ہال بن

جاتا تھا۔ بنگلہ گانے کی میٹھی گونج ہر طرف چھا جاتی۔ ہندی کے رسیلے گانے اور اُردو کی رنگین اور دلکش نظمیں بھی گائی جاتیں، مس انجلو کا پیانو بھی کبھی کبھی انگریزی نغمے سے تھرتھرانے لگتا تھا۔ ان سارے نغموں کی گونج فرحانہ کے دل میں بھی گدگدی پیدا کر دیتی تھی۔ اور وہ بچاری اپنی بھاری بھرکم شلوار میں دوپٹے کو گلے میں لپیٹے اپنا پشتو گانا شروع کر دیتی، اُس کے فارسی گانے کسی کی سمجھ میں تو کبھی نہ آتے تھے لیکن اس کے لیئے اپنا ترنم ہی کانوں کو خوشگوار لگتا تھا۔ مگر جہاں اس نے اپنا وطنی گیت پشتو گانا شروع کیا اور لڑکیاں چلّا اٹھتیں کہ "بھئی بس کرو"۔ اس کو مردے چیرنے کی وحشت سے کہیں زیادہ ہی گھبراہٹ اس پشتو گانے سے ہوتی تھی ـــــ اور بچاری فرحانہ اپنے گھر کو اُنہی پشتو گیتوں میں یاد کر لیا کرتی تھی ـــــ! فرحانہ ہوسٹل کی ساری لڑکیوں کے لئے ہمیشہ ایک معمہ ہی بنی رہی اتنی لمبی چوڑی سپاٹ سی پہیلی کسی کی سمجھ میں آ بھی کہاں سکتی تھی۔ لڑکیاں تو بچاری لڑکیاں ہی ٹھہریں کالج کے لڑکے بھی نہ سمجھ سکتے تھے۔ کہ اس لڑکی کی رگوں میں افغانی خون کس تیزی سے چکّر لگایا کرتا ہے۔ ہوسٹل بھر میں فرحانہ ہی ایک شوخ اور آزاد لڑکی تھی۔ وہ اکثر پینٹ اور ٹائی کے ساتھ کالج جاتی، اور کالج بھر میں سب سے زیادہ خوبصورت لڑکے سے محبت کرتے کرتے وہ یک بیک اسی کالج کے سن رسیدہ مگر کنوارے پروفیسر سے شادی کر کے پڑھائی چھوڑ چھاڑ کر بیٹھ رہی ـــــ! برجیس ناہید اور شیلا ایک ہی کمرے میں رہتی تھیں۔ دوسرے کمروں میں بھی اسی طرح تین تین لڑکیاں ایک ساتھ تھیں اوپر کی منزل لڑکیوں سے بھر گئی تھی۔ مگر نیچے کے

سارے کمرے ایسے ہی خالی بند پڑے تھے۔ جب سے اچانک طور پر فرحانہ اپنی شادی کر کے یہاں سے چلی گئی تھی۔ ہوسٹل بھر پر ایک افسردگی سی چھا گئی تھی جیسے لڑکیوں کو اپنے پر سے اعتبار جاتا رہا تھا، سو گیتی اپنی بڑی بڑی آنکھیں گھما گھما کر فرحانہ کے اس تغیر پر لمبی لمبی بحثیں کیا کرتی۔ ہوسٹل بھر میں ایک انتشار سا پھیل گیا تھا، مگر برجیس ایک ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بس خاموش ہی رہتی۔ شیلا اور منورما کی زندگی پر یہ واقعہ زیادہ اثر انداز ہوتا تھا۔ اس کے بعد سے وہ اپنے دلوں میں اپنی محبتوں کو زیادہ شدید طور پر محسوس کرنے لگی تھیں ——
برجیس کا دل بہت حساس تھا اور وہ ایک جذباتی لڑکی بھی تھی۔ پھر بھی وہ شیلا اور منورما جتنی متاثر نہیں ہوئی۔ کالج اور اسپتال کی ڈیوٹی میں بھی وہ سب سے الگ تھلگ دامن کشاں رہتی تھی۔ ایک دم کھلکھلا کر ہنستی رہنے والی برجیس اپنے ہوسٹل کے احاطے سے بڑی سنجیدگی کے ساتھ باہر نکلتی اس کی بڑی بڑی گھبرائی ہوئی خوبصورت سی آنکھیں ایک ہرن کی طرح چوکنی رہتیں گہرے رنگ کا بارڈر لگی سفید ساری کے آنچل کا ایک کونا اس کی کمر کے گرد لپٹا رہتا اور دوسرا ایک لمبا کونا اس کے پیچھے جھولتا رہتا تھا۔ اس کے بالوں کا سیاہ جوڑہ اس کی گردن اور ساری کے بارڈر پر مچلتا، اس کے گلے میں سونے کا ہار اور کانوں میں حلقے دار بجلی دور ہی سے چمکتی اور وہ جھومتی ہوئی چال اور گھبرائے ہوئے انداز سے آہستہ آہستہ چلتی ہوئی آ کر کالج اور اسپتال کے کاموں میں لگ جاتی۔ پہلے پہل جب وہ مردہ چیرنے والے کمرے میں داخل ہوتی تو اس کے ہاتھوں میں لرزتے ہوئے نشتر کو دیکھ کر بہت سی آنکھیں حیران

رہ گئی تھیں۔ اور کچھ دیر کے لئے لکچر دیتا ہوا پروفیسر بھی گھبرا گیا تھا —— اور اب وہ ڈاکٹری کا آخری سال ختم کر دینے والی تھی۔ اسپتال کی ذمہ دار ڈیوٹیاں اس کے سپرد ہونے لگی تھیں —— ! اپنی پڑھائی کے اتنے لمبے عرصے میں بھی وہ سب سے اتنی کنارے کنارے رہتی تھی۔ کہ ایک ساتھ کالج آتے جاتے ہوئے بھی بہت سے چہرے اس کو نئے نظر آتے وہ ہمیشہ سب سے آخر میں کلاس کے اندر داخل ہوتی اور آخر ہی میں وہاں سے نکلتی بھی تھی۔ اسٹیتھکوپ کو گلے میں لٹکائے جب وہ سب سے بچ کر نکل جانا چاہتی اور اس وقت کہیں سے یک بیک فیروز ٹپک کر اُس سے خواہ مخواہ کی باتیں شروع کر دیتا تو برجیس کا کھلتا ہوا سانولا نمکین چہرہ شرم سے تمتما جاتا، فیروز کبھی اس کے بھائی کا ساتھی رہ چکا تھا۔ اور اسی لئے وہ اپنے کو برجیس سے بہت نزدیک محسوس کرتا تھا۔ فیروز کی پڑھائی ختم ہو چکی تھی۔ اور اب وہ اسپتال کے تجربے حاصل کر رہا تھا —— فیروز کے دل میں برجیس بس رہی تھی۔ اس کی نگاہیں برجیس کی جھکی جھکی آنکھوں میں اپنے لئے کوئی پیغام ڈھونڈتی رہتیں مگر پانچ سال کی اتنی طویل مدت میں بھی برجیس اپنی گھبراہٹ اور پریشانیوں کو دور نہ کر سکی تھی۔ کالج کی ساری لڑکیوں میں وہ سب سے زیادہ شرمیلی اور خاموش تھی۔ مگر ہوسٹل کے احاطے میں داخل ہوتے ہی وہ بالکل بدل جاتی ہنسی کے چشمے اس کے لبوں سے پھوٹ بہتے اور وہ سارے ہوسٹل پر چھا جاتی۔ دوسری لڑکیوں کو برجیس کی اس کامیاب ایکٹنگ پر بڑی حیرت ہوتی تھی اور برجیس کو خود ان لوگوں پر بہت تعجب ہوتا تھا۔ کہ ہر کسی سے آزادانہ طور پر ملتے ہوئے انہیں کیسا لگتا ہوگا؟ اس کا یہ اصول تھا۔ کہ جب تک اپنی پسند کے

ملنے والے نہ ہوں بے تکلفی اچھی نہیں لگتی اور اسی لئے وہ فیروز سے بھی کترا کر نکل جانا چاہتی تھی۔ ناہید، شیلا اور شانتی فیروز کے اخلاق کی قائل تھیں۔ اور انہیں برجیس کی اس اصولی زندگی سے بڑی الجھن ہوتی تھی۔ کھیل کے مقابلے میں ساری لڑکیاں تیتری کی طرح دوڑ دوڑ کر انعام لیا کرتیں۔ مگر برجیس کے پاؤں ڈگمگانے لگتے تھے اور اتنے لوگوں کی موجودگی کے خیال سے وہ پیچھے ہٹ جاتی تھی کبھی اس نے کسی مقابلے میں حصہ نہ لیا تھا ـــــ اور شائد یہی گریز ہی تھا۔ جس سے کالج اور ہوسٹل کے بعض لڑکے خواہ مخواہ اس کے قریب آنا چاہ رہے تھے اور اسی احساس نے برجیس کو اور بھی بزدل بنا دیا تھا۔ وہ رات اور دن کی ڈیوٹیوں میں کبھی تنہا رہنا نہیں چاہتی تھی کسی نرس اسٹاف یا اپنی ساتھی لڑکیوں کے بغیر کسی کام میں اس کا جی نہ لگتا تھا۔ اسپتال کی دائیاں تک اس سے مذاق کرتیں "مس صاحب آپکو اکیلے میں ڈر لگتا ہے" پہلے وہ اتنی بزدل نہ تھی مگر جب ایک بار وہ وارڈ کے لفٹ پر چڑھی تو فیروز بھی اسی چھوٹے سے لفٹ میں اس کے ساتھ آگیا اور اتنے تھوڑے سے وقفے میں اُس نے برجیس کی دکھتی ہوئی رگ میں نشتر چبھو دیا۔ "مس برجیس آپ مجھ سے اتنا گھبراتی کیوں ہیں؟ میں آپ کے لئے کوئی غیر تو نہیں" ـــــ برجیس کی گھنی سیاہ پلکیں ایک لمحے کے لئے اُوپر اٹھیں۔ فیروز اس سے کتنا نزدیک تھا۔ پریشان سی وہ بس اتنا ہی کہہ سکی "میں گھبراتی تو نہیں مسٹر فیروز" ـــــ اور جب وہ لفٹ سے اوپر کی منزل پر اتری تو اس کے چہرے کا رنگ اُڑا ہوا تھا ـــــ! اور پھر ایک دفعہ جب وہ اپنے وارڈ سے واپس جا رہی تھی اسی کوریڈور سے فیروز آ رہا تھا۔ وہ اُسے آتا دیکھ کر

ٹھہر گیا اور بڑی آہستگی سے بولا "مس برجیس اس اسٹریتھکوپ سے آپ کتنے دلوں کی دھڑکنیں سن چکی ہوں گی ——— مگر کاش" ——— وہ اس سے زیادہ نہ سن سکی اُس دن سے اسے فیروز سے ایک چڑ سی ہو گئی تھی۔ اور اس کا جی چاہتا تھا۔ کہ وہ اسے کبھی نہ دیکھے ——— !

فرحانہ کی یاد اب ہوسٹل سے مٹتی جا رہی تھی ایسٹر کی چھٹیوں کے بعد نیلو جب اپنے گھر سے لوٹی تو سیندور کی ایک بڑی سی سرخ بندی اس کی خوبصورت پیشانی پر دمک رہی تھی اور اس کی ٹیڑھی مانگ میں بھی ہلکا سا سیندور بھرا ہوا تھا۔ اس کی آواز میں یک بیک جیسے ستار کے نغمے بھر دیئے گئے تھے اور اس کی آنکھوں سے ہر دم سرشاریاں چھلکی پڑتی تھیں، اس کے آتے ہی سارے ہوسٹل پر ایک آرزو انگیز خمار سا چھا گیا تھا ——— بہت سے دلوں میں تمنائیں بیدار ہو گئی تھیں اور بہت سی آنکھیں سامنے خلاؤں میں مبہم سے خواب دیکھتی رہتیں۔ نیلو اپنی شادی کی خوشی میں اپنے کالج کے ساتھیوں اور دوستوں کو دعوت دے رہی تھی، زنانہ ہوسٹل کا اتنا بڑا احاطہ کرسیوں اور میزوں سے بھر دیا گیا۔ سفید سفید میز پوشوں پر رنگین پھولوں کے گلدان بڑے حسین نظر آ رہے تھے۔ چھوٹی چھوٹی اکیس میزیں چن دی گئیں۔ نیلو کے ساتھ ساری لڑکیوں نے ملکر ایک ایک چیز پکائی تھی۔ اور ان میزوں پر وہی لڑکیاں بٹھائی گئی تھیں جن کی پکائی ہوئی چیز اس میز پر تھی اتوار کا سارا دن لڑکیوں نے چیزیں پکانے میں گذارا تھا۔ بنگلہ۔ مرہٹی، پنجابی، بہاری اور یو۔ پی کی بہترین چیزیں تھیں۔ ساری لڑکیاں اپنی اپنی میزوں کے پاس مہمانوں کی منتظر تھیں۔ لوگ آ آ کر اپنی کرسیوں پر بیٹھتے جا رہے تھے، برجیس نے انڈے کا حلوہ بنایا تھا۔

سفید پلیٹ میں سنہری جلوہ ساری چیزوں کے درمیان لہک رہا تھا۔ نیلو اس کی میز پر بھی تین مہمانوں کو لئے ہوئے آئی۔ اور ستاروں کی سی درخشاں مسکراہٹ کے ساتھ اس نے تعارف کرایا ” برجیس یہ مسٹر گھوش ہیں۔ سکستھ ایر کے اسٹوڈنٹ یہ ممتاز صاحب آئی۔ ایم۔ ایس ہیں۔ اور یہ ہیں ڈاکٹر ہاشمی“ وہ اتنا کہہ کر چلی گئیں کیونکہ ابھی یہ فرض اسے بہت سی جگہ ادا کرنا تھا۔ ! گھبرائی ہوئی برجیس اپنی شرمگیں نگاہوں سے انہیں دیکھ رہی تھی اس کے لبوں پر ایک حیا آمیز تبسّم چھا رہا تھا۔ اور اس کے ملیح چہرے پر شفق کی سی سُرخی دوڑ رہی تھی۔ مسٹر گھوش کے لئے یہ جگہ ذرا غیر موزوں سی تھی۔ اسی لئے وہ خاموش سا تھا۔ ممتاز حال ہی میں یورپ سے ڈگری لے کر آیا تھا۔ اس لئے اس کا لب و لہجہ برجیس کو غیر مانوس سا لگ رہا تھا۔ کھانے کی پلیٹوں میں باری باری وہ اپنے دونوں ہاتھوں کو استعمال کر رہا تھا۔ اور اس کے ساتھ ہی اس کی لمبی گفتگو بھی جاری تھی۔ وہ ڈاکٹر ہاشمی سے باتیں کر رہا تھا۔ اور ڈاکٹر ہاشمی کی خوبصورت آنکھیں بار بار برجیس کی نگاہوں سے ٹکراتی ہوئی ممتاز کی طرف متوجہ ہو رہی تھیں ——— یک بیک ممتاز کی آنکھیں برجیس پر جم کر رہ گئیں اور وہ اس سے بہت سی باتیں کرنا چاہ رہا تھا۔ مگر برجیس کی جھکی ہوئی نظریں اور اس کی باتوں کے مختصر سے جواب اسے اور زیادہ آگے بڑھنے نہ دیتے ” شاید آپ فرسٹ ایر یا سیکنڈ ایر میں ہیں “ ——— آخر ممتاز نے برجیس کی پریشان نگاہوں کو دیکھ کر پوچھا ——— ” مس برجیس اب ڈاکٹری کا آخری سال ختم کر رہی ہیں “ ——— برجیس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں اس کی سیاہ بھاری بھاری پلکیں اوپر اُٹھیں اور وہ ایک ہلکے سے تبسّم کے ساتھ آہستہ سے بولی۔ ڈاکٹر ہاشمی

آپ مجھے جانتے ہیں "۔۔۔؟ جی ہاں صرف ایک ہی سال سے میں وارڈ کا انچارج بنایا گیا ہوں۔ اس سے پہلے اسی کالج کے ہوسٹل میں تھا۔" اس کا لب ولہجہ اور باتوں کا انداز اتنا اچھا تھا کہ برجیس بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی ۔۔۔۔۔ !اس کے بعد ۔۔۔ اکثر اس کے وارڈ کی طرف سے گذرتے ہوئے برجیس کو شمی کا خیال آجاتا ۔۔۔۔۔ وہ اس وقت کیا کر رہا ہوگا؟ ۔۔۔۔ کہاں ہوگا ایسے بہت سے خیالات خواہ مخواہ اُسے ستانے لگتے تھے۔ کئی دفعہ اُس نے ڈیوٹی روم یا اپریشن روم کے در پر اُسے کھڑا دیکھا تھا۔ وہ نائٹ ڈیوٹی سے بہت بیزار رہتی تھی لیکن اُسے مجبوراً جانا ہی پڑتا تھا۔ سکستھ ایر میں یہی مصیبتیں تھیں کہ پڑھائی سے کہیں زیادہ تجربے کرنے پڑتے تھے۔ گرمی کی راتیں چھوٹی تو ضرور ہوتی تھیں مگر اسپتال میں اکیلے ڈیوٹی کرتے ہوئے یہ بھی بہت گراں گزرتی تھیں ۔۔۔۔۔ ایسی ہی ایک رات تھی۔ جنرل وارڈ میں قطار در قطار لوہے کے سیاہ پلنگوں پر کچھ مریض سو رہے تھے اور کچھ کراہ رہے تھے برجیس اپنے سارے کام ختم کر کے کرسی پر بیٹھی کوئی کتاب پڑھنا چاہ رہی تھی کتنی دیر کے بعد اس کے خیالات یکجا ہو سکے تھے۔ کہ ایک بیک ٹائیفائیڈ کا ایک خطرناک کیس اس کے وارڈ میں لایا گیا مریض بیہوش تھا اس کے لئے فوری توجہ کی ضرورت تھی مگر وارڈ کے پلنگ سب کے سب بھرے ہوئے تھے۔ اور رات کو ایسے وقت میں داخلہ او۔ ڈی ہی کر سکتا تھا۔ برجیس کو کوئی پتہ نہ تھا۔ کہ آج کون ڈاکٹر ڈیوٹی پر ہے۔ وہ او۔ ڈی روم کی طرف جا رہی تھی مگر اس خیال سے اس کا دل گھبرا رہا تھا کہ نہ جانے کس قسم کے ڈاکٹر سے پالا پڑے گا وہ جھلائے ہوئے مزاج سے بہت گھبراتی تھی۔

—— اس نے جاکر دیکھا کہ ڈاکٹر اس کمرے میں بے خبر کرسی پر سو رہا ہے —— دودھیا بلب کی دھیمی روشنی ہر طرف پھیل رہی ہے۔ اس نے جا کر زور سے کواڑ کو کھولا —— وہ نیند سے چونک پڑا —— ڈاکٹر ٹائیفائیڈ کا ایک سیریس کیس آیا ہوا ہے"۔ نیند سے بھری ہوئی آنکھوں کو مشکل سے کھولتا ہوا وہ ساتھ چلنے کے لئے کھڑا ہو گیا —— "اچھا مس برجیس آپ ہیں" —— ؟ یک بیک برجیس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ ڈاکٹر شمی سے اس کی یہ دوسری ملاقات تھی اور وہ بھی ایسے اچانک طور پر مریض کا داخلہ ہو گیا اور وارڈ پر پھر وہی پہلی سی خاموشی چھا گئی —— ڈاکٹر شمی برجیس کو اس نئے مریض کے حالات بتانا چاہ رہا تھا۔ مگر برجیس خاموش کھڑی تھی۔ اس کی جھکی جھکی نگاہیں کبھی کبھی اوپر اٹھتیں اور شمی اس کی متوجہ ہوتی ہوئی نگاہوں کا منتظر رہتے رہتے گھبرا رہا تھا —— "بھئی بات تو سن لیجئے نا" —— پھر بھی اس کی آنکھیں بار بار جھکی جا رہی تھیں —— یہ دیکھ کر وہ اطمینان سے میز کے اوپر بیٹھ گیا۔ —— "معلوم ہوتا ہے آج آپ کی جگہ مجھے ہی ساری رات یہاں ڈیوٹی دینی پڑے گی"۔ اس کی مخمور آنکھوں میں شرارت چمک رہی تھی —— اس کا کھلتا ہوا صندلی رنگ صبح کے اجالے کی طرح لگ رہا تھا اس کی آنکھوں کی چمک اور لبوں کے خوبصورت خم میں ایک عجیب پر اثر کشش تھی۔ پہلی بار برجیس کا دل چاہا کہ وہ سچ مچ یہاں سے کبھی نہ جائے۔ مگر وہ ایک لمبی سیٹی بجاتا ہوا بے معنی طور پر وارڈ میں ایک چکر لگا کر چلا گیا۔ برجیس کے دل کی دھڑکنوں میں چند نئی دھڑکنیں بیدار ہو گئی تھیں وہ اور زیادہ گھبرائی گھبرائی سی رہنے لگی تھی —— اکثر سر راہے اس کی شمی سے ملاقات ہو جاتی

برجیس کو دیکھتے ہی بڑے ادب سے ہاشمی اپنا ہیٹ اتار کر ایک خاص انداز میں اسے سلام کیا کرتا اور پھر اس کے لبوں پر وہی شریر مسکراہٹ پھیل جاتی برجیس کے پاس ان باتوں کے جواب میں صرف اس کی کھوئی ہوئی خاموش نگاہیں تھیں یا ایک ہلکا سا تبسم، اُنہی دنوں شیلا اور برجیس کی ڈیوٹی اس وارڈ میں ہو گئی تھی۔ جہاں ہاشمی تھا۔ نامعلوم طور پر برجیس کو یہ تبدیلی بہت اچھی لگی۔ شائد اس لئے کہ اس وارڈ کے اتنے وسیع حصّوں میں کچھ زیادہ خراب مریض نہ تھے۔ سارا سارا دن اور ساری ساری رات اُسے ہفتوں وہاں ڈیوٹی دینی تھی۔ یہ وارڈ بہت سے حصوں میں تقسیم ہو کر بہت دور تک پھیلتا چلا گیا تھا۔ اوپر کی منزل پر بہت بڑا اپریشن روم تھا لیکن سائڈ روم اور جنرل وارڈ کے لمبے لمبے کمرے الگ الگ تھے۔ شمالی لمبا کمرہ جیسے ہی ختم ہوتا اس کے پیچھے ایک بہت بڑا اور خوبصورت سالفٹ تھا۔ اور اس کے بعد ایک بہت چوڑا برآمدہ جس میں آبنوسی کٹہرے سے گھرا ہوا سُرخ سیمنٹ کا ایک زینہ اُوپر آنے اور ایک نیچے جانے کے لئے تھا اُسی برآمدے سے دو شاخیں نکلتی تھیں۔ ایک تو مغرب کی طرف جاتی تھی اور دوسری مشرق کی طرف۔ دونوں طرف اس وارڈ کے ڈاکٹروں اور لیڈی ڈاکٹروں کیلئے کوارٹر بنے ہوئے تھے۔ اور اس وارڈ کا لکچر بھی اسی طرف ایک بڑے کمرے میں ہوتا تھا —— اسی مشرقی حصّے میں شیلا شانتی اور برجیس کو رہنا تھا۔ اپنے اس نئے کوارٹر سے جب وہ شام کی ڈیوٹی پر جانے لگی تو دوسری طرف کے کمرے سے ڈاکٹر ہاشمی نکل رہا تھا وُہ اس کے قریب آتے ہوئے شوخی سے بولا "—— "برجیس صاحبہ میں آپ کو خوش آمدید کہتا ہوں" —— اور اتنا کہہ کر وُہ نہ جانے کہاں چلا گیا اسی ہاشمی اور اس

کی شوخ نگاہوں نے اُسے ایک اُلجھن میں مبتلا کر دیا تھا ــــــ دوسرے دن دوپہر کو شیلا کے ساتھ ڈاکٹر منوہر اس کے کمرے میں آگیا اور وہ بضد ہو کر شیلا کے ساتھ برجیس کو بھی اس دوسری طرف اپنا کمرہ دکھانے کے لئے لے گیا۔ سچ مچ اس نے اپنا کمرہ بہت اچھا سجایا تھا۔ چینی دستکاری سے کمرہ بہت ہی اچھا لگ رہا تھا۔ السٹریٹڈ ویکلی کی خوبصورت تصویریں اس نے بڑی صفائی کیساتھ قینچی سے کاٹ لی تھیں اور ایک مہین دھاگے میں ان کے سروں کو اٹکا کر اسے دیوار پر سیدھا ٹانگ دیا تھا۔ جیسے جیسے ہوا چلتی، دیوار سے لگی ہوئی ساری تصویریں رقص کرنے لگتیں ــــــ اس کے کمرے سے ملا ہوا ایک ڈرائنگ روم تھا۔ اس کے بعد کچن اور باتھ روم تھے، ــــــ جب وہ سب کچھ دکھا چکا تو سب کو لئے دوسرے کمرے میں آیا۔ ڈاکٹر شمی سلیپنگ سوٹ پہنے بے خبر سو رہا تھا۔ ڈاکٹر منوہر کے چہرے پر ایک شرارت چمکی اس نے اپنی جیب سے دیا سلائی اور باریک سی روئی نکالی اور شمی کے پاؤں کی انگلیوں پر رکھ کر اس میں سلگتی ہوئی دیا سلائی لگا دی ایک ہلکا سا شعلہ بھڑکا اور شمی تڑپ کر اُٹھ بیٹھا۔ شمی کے کمرے کی لمبی دریچی کے پیچھے چھپی ہوئی برجیس یہ تماشہ دیکھ رہی تھی ڈاکٹر منوہر اور شیلا کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ وہ دیکھو شمی اس دریچے کے پیچھے فاختہ اڑا کر برجیس کتنی معصوم بنی ہوئی ہے ــــــ! شمی کی مسکراتی ہوئی شریر آنکھیں برجیس پر جم کر رہ گئیں ــــــ "نہیں ڈاکٹر شمی میں نہ تھی یہی منوہر بابو تھے اور شیلا تھی" ــــــ! وہ شرمائی سی جا رہی تھی پنکھا چل رہا تھا۔ پھر بھی اُسے پسینہ آ رہا تھا محترم برجیس صاحبہ مجھے بھی بدلہ لینا آتا ہے۔" وہ جانتا تھا کہ یہ شرارت منوہر

اور شیلا کی بھی پھر بھی اُسے شاید برجیس کو ستانا اچھا لگ رہا تھا ——— ! منوہر اور شیلا کے ساتھ برجیس بھی جب واپس جانے لگی تو شمی نے بڑے معصومانہ انداز میں کہا۔ "ٹھہریئے تو مس برجیس آپ کو مسٹر فیروز نے ایک بہت ضروری بات کہلائی ہے" شیلا فیروز کا نام سنتے ہی منوہر کا ہاتھ پکڑے ہوئے وہاں سے ہنستی ہوئی بھاگ گئی ——— برآمدے کے کٹہرے پر جھکی ہوئی برجیس نیچے سڑک پر بازار کی رونق دیکھ رہی تھی۔ اس کا دل فیروز کا نام سُن کر زور زور سے دھڑکنے لگا تھا اور پریشان پریشان سی لگ رہی تھی ——— ڈاکٹر شمی اپنے کپڑے تبدیل کر چکا تھا۔ وہ ہنستا ہوا برجیس کے پاس آ کر اسی طرح کٹہرے سے لگ کر کھڑا ہو گیا ——— "سن رہی ہیں؟ وہ کیا کہہ رہا ہے آپ سے" ——— ؟ برجیس کے چہرے کا رنگ اور اُڑتا جا رہا تھا ——— "کون فیروز ——— ؟" نہیں بھائی یہ سامنے داس کا باجا" ——— قریب ہی بادامی رنگ کی ایک بہت خوبصورت اونچی سی میوزک شاپ کی عمارت تھی جس میں سے ہر گھڑی لاؤڈ سپیکر پر گانوں کے ریکارڈ بجتے رہتے تھے اور اس وقت بھی سارا بازار اس کے نغمے سے گونج رہا تھا ——— کھوئے کھوئے نینوں والی کس کی یاد ستائے؟" برجیس ایک لمحے کے لئے شرما گئی۔ ایک دم سے اس کا چہرہ ہنسی کی لہروں سے دمک اُٹھا۔ اور پہلی بار وہ ہنستی ہوئی بولی ——— "ڈاکٹر شمی بڑے شریر سے ہیں آپ" "شریر میں ہوں کہ داس کا باجا ——— " وہ برجیس کی آنکھوں کو تکتا ہوا زور سے ہنس پڑا ——— "جی ہاں مس برجیس صاحبہ کل فیروز بھی کہہ رہا تھا کہ آپ کی شرمیلی آنکھوں کے اس کھوئے کھوئے انداز میں ایک عجیب کشش ہے" ——— "جی نہیں میں جانتی ہوں آپ جھوٹ

کہہ رہے ہیں"۔۔۔۔ "تو اگر فیروز نے نہیں کہا ہے تو پھر اسی داس کے باپ نے کہا ہوگا"۔۔۔۔ اس کے بعد ہنستا ہوا شمی اپنے ہیٹ سے برجیس کو سلام کا اشارہ کرکے اس کی جھکی جھکی ہوئی آنکھوں کو تکتا ہوا ایک بیک ہال سے چلا گیا۔۔۔۔!

نامعلوم طور پر برجیس جیسے ایک گرداب میں ڈوبتی جا رہی تھی۔ وہ جہاں کہیں بھی جاتی کیسے ہی کاموں میں لگی ہوتی بس ایک ہی تصور وہی دو شریر ہنستی ہوئی نگاہیں اس کی آنکھوں میں گھومتی رہتیں۔ شمی اپنے کاموں میں لگا رہنے پر بھی بار بار اپنی خاموش نظروں سے اسے دیکھتا رہتا تھا۔ اس کے صندلی چہرے پر سنجیدگی چھائی رہتی اور لمبی لمبی پلکوں والی مخمور نگاہیں شرارت سے چمکتی رہتی تھیں۔ وہ جیسے جیسے چلتی جدھر جدھر جاتی شمی کی شوخ آنکھیں اس کا خاموش تعاقب کرتی رہتیں انہیں دیکھ کر برجیس کے پاؤں ڈگمگانے لگتے اور ایک ہیجانی سی اس کی رگ رگ میں تڑپنے لگتی تھی پھر بھی اُسے یہ تڑپ عزیز تھی۔ اور یہی اضطراب ایک سرور بن کر اس کی روح پر چھا جاتا۔۔۔۔! وہ بہت کچھ سوچنا چاہتی تھی۔ مگر جیسے اس کا دماغ تھک کر بیکار ہو چکا تھا۔۔۔۔ اس نے سُنا تھا۔ کہ اسکی کھوئی کھوئی آنکھوں میں ایک کشش تھی لیکن اُسے خود ہی کوئی کشش کہیں کھینچے ہوئے لئے جا رہی تھی۔۔۔۔ کبھی کبھی شمی کو وہ اپنے بہت نزدیک محسوس کرتی اور کبھی وہ اس سے بہت دُور نظر آتا تھا۔۔۔۔ خود بخود کبھی اس کا دل بہت گھبرانے لگتا اور وہ اپنے ہر طرف تنہائی ہی تنہائی محسوس کرنے لگتی تھی۔ ایسے ہی بے معنی طور پہ وہ اپنے کمرے سے باہر آ کر بیچ کے چوڑے

برآمدے کے لمبے دریچے پر جھکی پر رونق بازار کو دیکھتی رہتی اس کی نظریں سامنے سڑک پر جمی رہتیں مگر اس کی روح قریب ہی شمی کے کمرے میں منڈلاتی رہتی تھی۔ جہاں شمی کبھی تو بے خبر سویا رہتا کبھی وہاں سے اس کی باتوں کی آواز آتی رہتی اور کبھی کمرہ ایسے ہی خالی پڑا رہتا تھا۔ ایک دفعہ جب اس طرف سناٹا تھا۔ منوہر اور شمی دونوں ابھی وارڈ ہی میں تھے۔ برجیس کو وارڈ سے آنا پڑا اسے نمونیہ کے ایک مریض کو پلاسٹر کی پٹی لگانی تھی مگر اسپتال کی اس الماری کی کنجی وہ اپنے کمرے میں غلطی سے بھول آئی تھی۔ اور جب وہ کنجی لئے واپس جا رہی تھی۔ اس نے شمی کا کمرہ کھلا ہوا دیکھا اور وہ غیر ارادی طور پر اس میں چلی گئی۔ سارا کمرہ شمی کی مخصوص خوشبو سے معطر ہو رہا تھا۔ جاتے ہی اس کی نظر شمی کے سرہانے اس کے موٹے سے البم پر پڑی اور وہ اسے ایسے ہی بے خیالی میں اٹھا کر دیکھنے لگی ——— سب سے پہلے ہی شمی کی تصویر تھی وہی معصوم خوبصورت سا چہرہ اور شوخ آنکھوں میں شرارت بھری ہوئی تھی اور لب پر وہی شریر مسکراہٹ کھیل رہی تھی ——— اُس نے دوسرا صفحہ کھولا ہی تھا کہ دھک سے رہ گئی۔ شمی کی ایک اور زیادہ شوخ سی تصویر کے پہلو میں خود اس کی اپنی تصویر وہاں سنہرے گوشوں میں لگی ہوئی تھی اور اس کی تصویر کے نیچے لکھا تھا ——— "اپنی تصویر پر نازاں ہوں تمہارا کیا ہے"؟ ——— کمرہ خالی پڑا تھا پھر بھی اس کا چہرہ شرم سے تمتما گیا ——— کہیں کوئی اسے دیکھ لے تو ———؟ اس نے چپکے سے اپنی تصویر نکال لی، اسے حیرت تھی کہ اس کی تصویر یہاں پہنچی کس طرح؟ کیا شمی اکیلے میں اُس کے کمرے سے چرا کر لایا تھا ———؟ وہ پلاسٹر کی پٹی لئے سیدھی شمی کے پاس آئی ——— اس

کے قدم لڑکھڑائے جا رہے تھے اور اس کی آنکھیں شمی کے سامنے خود بخود جھکی جا رہی تھیں۔ —— "اوہ برجیس صاحبہ ذرا تیز چلنا سیکھئے اتنی دیر لگا دی آپ نے۔ —— " اوہ پھر وہ دونوں مل کر مریض کی پسلیوں کے نیچے پلاسٹر لگانے لگے شمی جان جان کر پلاسٹر کی پٹی برجیس کی کلائی اور کبھی اس کی انگلیوں پر لپیٹ لپیٹ دیتا تھا۔ اور جب برجیس اپنی تیز نگاہوں سے اسے گھورنے لگتی تو وہ بالکل معصوم بن جاتا —— "آپ کا جی نہیں گھبراتا۔ ان کاموں سے ؟" "اب تو گھبرا گھبرا کر اس کی عادی ہو چکی ہوں" —— ! مجھے بھی حیرت ہے کہ آپ جیسی بزدل لڑکی کیسے آگئی یہاں کالج میں دیکھتی ہیں اتنی ساری لڑکیوں میں کوئی بھی ہے آپ کی طرح چپ چاپ گھبرائی گھبرائی سی —— ؟" "شائد آپ نے دیواروں پر لگا ہوا وہ اشتہار نہیں دیکھا ہے کہ خوب ہنسو اور موٹے ہو جاؤ" —— برجیس اور شمی ایک ہی ساتھ کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

شام کو اکیلے بیٹھے بیٹھے برجیس کا جی اُکتایا اُکتایا ہوا سا لگ رہا تھا شیلا اور شانتی ہوسٹل گئی ہوئی تھیں۔ اس طرف شمی کے کمرے سے ریڈیو کے ہلکے ہلکے گانے کی آواز آرہی تھی۔ عجیب ہے یہ شمی بھی، کبھی تو ایسا لگتا ہے جیسے وہ مجھے جانتا ہی نہیں بے پروا بے پروا سا اکھڑا اکھڑا ہوا —— اور دو دنوں سے تو اسے اپنی ڈیوٹی، اور اس کے بعد اپنے کمرے میں خاموشی سے لیٹ کر ریڈیو سننے کے سوا کسی سے کوئی غرض ہی نہیں تھی —— وہ کیسی پیچیدہ سی پہیلی بوجھنا چاہ رہی تھی —— ! بہت دنوں کے بعد اس کے دل میں سنیما جانے کی خواہش پیدا ہوئی، تیار ہو کر جاتے ہوئے وہ لفٹ پر چڑھ کر اس کی جالیاں کھینچ

کر بند ہی کرنے والی تھی کہ اچانک اس میں شمی آگیا۔ شمی نے جالیوں کے دروازے بند کر دیئے اور سوئچ کو دبا دیا لفٹ نیچے اُترنے لگا تھا مگر جیسے ہی وہ زمین سے لگنے لگا کہ اس نے دوسرا سوئچ دبا دیا ——— لفٹ تیزی سے اُوپر اُٹھنے لگی۔ اس کے سنجیدہ چہرے پر یک بیک پھر وہی شرارت چھا گئی تھی ——— لفٹ کی سطح چھت کے کناروں سے لگنے والی ہی تھی کہ وہ پھر نیچے کی طرف اُتر رہا تھا۔

——— "اُنہہ ڈاکٹر شمی آخر آپ مجھے ستا کیوں رہے ہیں ——— ؟ اور جو یہ کہیں خراب ہو کر بیچ ہی میں اٹک جائے تو ——— ؟" "تو پھر ہم اور آپ اس لفٹ کے چہرے دان میں دو چہرے نظر آئیں گے اور کیا!"

سینما میں بھی برجیس کا جی نہ لگا جب وہ واپس آئی تو اس کے کمرے میں شیلا شانتی منوہر اور فیروز برج کھیل رہے تھے، وہ خاموشی سے ان کا کھیل دیکھتی رہی شیلا اور منوہر برابر بنا رہے تھے۔ اور بچارہ فیروز اور شانتی ہارتے ہی جا رہے تھے۔ شیلا کے قہقہوں سے کمرہ گونج رہا تھا۔ آخر فیروز پریشان ہو کر بولا ———

"مس شیلا جانتی ہیں جو تاش کے کھیلوں میں ہارتا ہے اُسے اپنی قسمت کے کھیلوں میں ہمیشہ فتح ہی نصیب ہوتی ہے" ——— ! برجیس کو فیروز پر افسوس آنے لگا۔ "بچارہ ——— کیا معلوم اس کی قسمت کے ستارے کہاں چمک رہے ہوں گے" ——— ؟ اس طرح اسے فیروز سے ایک ہمدردی ہو گئی تھی۔

——— کبھی کبھی جب فرصت ہوتی تو شیلا شانتی اور برجیس منوہر اور شمی کے کمروں میں چلی جاتیں۔ منوہر ہمیشہ ان کی چائے سے مہمان نوازی کرتا اور بچارہ شمی ان لڑکیوں کو اپنے کمرے میں آتا ہوا دیکھ کر گھبرا جاتا تھا ——— ! برجیس کی

عادت تھی کہ وہ جب بھی بیٹھتی تکیہ کو گود میں لے کر اس پر جھکی رہتی تھی اور جب کبھی وہ شمی کے کمرے میں جاکر بیٹھنے لگتی۔ شمی ہمیشہ اسے اپنا تکیہ بڑھا دیتا وہ اس کے تکیہ پر جھکی اپنے گلے کے ہار سے کھیلتی رہتی۔ منوہر شیلا اور شانتی لمبی لمبی باتیں چھیڑ دیتے سب کے پیچھے چھپا ہوا شمی برجیس کو تکتا رہتا اور برجیس شرمائی شرمائی سی اُن کی باتیں سنتی رہتی ——— شمی کے تکیہ سے اس کی ہلکی ہلکی سی آتی ہوتی خوشبو اس کی روح پر ایک سرور بن کر چھا جاتی اور برجیس شمی کے تکیہ کو اپنے دل سے اور بھی زیادہ قریب کر لیتی تھی ——— !

سکستھ ایر کا سالانہ امتحان نزدیک آ رہا تھا اور اس پر وارڈ میں بھی یک بیک کاموں کی زیادہ ہوگئی تھی برجیس کالج اور اسپتال کی ڈیوٹی سے اتنی تھک کر چور واپس آتی، کہ کتاب پر نظر پڑتے ہی اس کا جی گھبرانے لگتا تھا۔ ایک دن وہ شام کو ڈیوٹی روم کے بڑے میز پر جھکی سُست کھڑی تھی ——— "ہیلو مس برجیس گڈ ایوننگ"۔ نجانے کہاں سے اچانک فیروز آ کر بولا "آپ کا امتحان تو بس اب بہت نزدیک ہے۔ کیسی ہو رہی ہے آپ کی تیاری"——— ؟" کچھ ہو ہی رہی ہے فیروز صاحب؟ وہ اسی طرح بے دلی سے بولی "شاید ——— آپ کو اگر کسی مدد کی ضرورت ہو تو مجھے یاد کر لیجئے گا ——— " وہ ذرا ہکلا ہکلا کر بولا ——— "شکریہ مسٹر فیروز ناسر دست مجھے اس کی ضرورت نہیں"۔ اپنے چہرے پر فیروز کی جمی ہوئی نگاہوں کو محسوس کر کے اس کا سانولا رنگ خون کی سرخی سے تمتما گیا ——— اسی وقت بہت سے فائل لئے ڈاکٹر شمی اپنے شام کے راؤنڈ پر آیا۔ ایک نگاہ غلط انداز اس نے برجیس پر ڈالی اور فیروز سے

باتیں کرنے لگا، برجیس اسی طرح سُست اور خاموش اپنی کہنیوں کے سہارے میز پر جُھکی ہوئی تھی ـــــ فیروز چلا گیا اور شمی میز پر فائیلوں کو پھیلائے الٹ پلٹ کر انہیں خواہ مخواہ دیکھے جا رہا تھا۔ کبھی کبھی اس کی سنجیدہ نگاہیں چپکے سے برجیس کی طرف بھی چلی جاتی تھیں ـــــ "ڈاکٹر شمی آخر یہ آپ کے وارڈ میں کہاں سے اتنے کام آ گئے ہیں" ـــــ "کہاں سے؟ آپ چارٹ پر ان جگہوں کے نام دیکھ سکتی ہیں"۔ "نہیں ڈاکٹر۔ میں اتنی سخت ڈیوٹی سے تھک گئی ہوں۔ شانتی کے بیمار ہو جانے سے اس کا کام بھی مجھ کو کرنا پڑ رہا ہے"۔ "تو پھر آپ بیمار ہونے کا کوئی بہانہ کر دیجئے"۔ ـــــ "شمی صاحب میں اپنے امتحان کی ذرا بھی تیاری نہیں کر سکی ہوں۔ میرا دماغ تھک کر بالکل بیکار ہو گیا ہے۔ میں کچھ سوچ ہی نہیں سکتی" ـــــ شائد میں سچ مچ بیمار ہوئی جا رہی ہوں" ـــــ تو پھر چلئے میں کیبن میں آپ کا بستره وغیرہ ٹھیک کر دوں۔ ایک دم سے اس کے سنجیدہ چہرے پر وہی شرارت دوڑنے لگی تھی۔ مگر برجیس اسی طرح افسردہ تھی ـــــ "سوگیتی کہہ رہی تھی کہ آپ نے ایک بار اس کی بہت مدد کی تھی" ـــــ برجیس اپنی ساری کا کونا انگلی پر لپیٹتے ہوئے ذرا جھجکتے ہوئے بولی ـــــ "اُنہہ سوگیتی اسی لئے تو اس دفعہ فیل بھی ہو گئی تھی ـــــ اور اب آپ کو بھی اس کا تجربہ کرانا چاہ رہی ہے" ـــــ "شاید فیروز آپ سے کچھ کہنا چاہتا تھا کہ میں آ گیا۔ بیچارہ فیروز، مجھے بہت ہمدردی ہے اس سے" ـــــ وہ بڑی سنجیدگی سے بولا ـــــ "اور مجھے آپ سے" ـــــ برجیس ذرا شوخ لہجے میں بولی ـــــ مجھ سے۔ مجھ سے کون ہمدردی کرے گا مس برجیس ـــــ اگر میں مر بھی جاؤں تو بھی

کوئی مجھے یاد نہ کرے گا۔ ہاں شاید آپ کبھی کبھی یاد کر لیں۔" ایک حسرت اور یاس اس پر چھا رہی تھی۔ اس کے شوخ لب جذبات کی شدت سے کانپ رہے تھے۔ برجیس پہلی بار شمی کی شریر آنکھوں میں ہلکے ہلکے تیرتے ہوئے آنسو دیکھ رہی تھی اور ڈیوٹی روم کے اندر شام کے پھیلے ہوئے اندھیرے میں اس افسردگی نے اس کی روح کو شمی کے اور بھی زیادہ قریب کر دیا تھا —— "جانتی ہیں؟ میں ساری رات بالکل نہیں سو سکا۔ بہت سے خیالات میرے پریشان دل و دماغ سے ٹکراتے رہے ہیں —— اور میں بہت سی باتیں صرف سوچتا ہی رہ گیا" —— "کون سی باتیں ڈاکٹر شمی؟" وہ پر اشتیاق لہجے میں بولی —— اس کی بھیگی ہوئی بوجھل پلکیں اوپر اٹھیں اور اس نے اسی طرح سنجیدگی کے ساتھ بے پروایانہ طور پر کہا —— "مس برجیس! بہت سی باتیں ایسی ہیں جو دوسروں سے نہیں کہی جا سکتیں" اور پھر وہ اپنا فائل اٹھا کر چلا گیا ——!

کئی دنوں تک سر راہے کبھی کبھی اس کی شمی سے ملاقات ہوتی رہی۔ —— وہ ویسے ہی اکھڑا اکھڑا ہوا سا تھا —— برجیس اپنے کمرے میں اپنی کتابوں سے کچھ پڑھنے کی ناکام کوشش کرتی رہتی مگر اس کے ہر طرف جیسے آندھیوں کے جھکڑ سے چلتے رہتے تھے —— اس کی زندگی میں ایک اہم تبدیلی آ گئی تھی —— اور اس کا دل جیسے کسی بہت بڑے حادثہ سے مجروح ہو گیا تھا —— جب وہ مریضوں پر جھکی رہتی اور ان کے دل کی دھڑکنیں اس کے کانوں میں گونجنے لگتیں تو اس وقت اسے مریض اور اسپتال کچھ بھی یاد نہ رہتا۔

اس کا جی چاہتا یہی اسٹیتھسکوپ چپکے سے اس کے کانوں میں بہت سی باتیں کہہ دے شمی کے بے پروا دل کی دھڑکنیں ۔ اس کی جاگتی ہوئی آنکھوں کا اضطراب اور پھر وہ ساری باتیں جو رہ رہ کر شمی کے دل میں طوفان لاتی رہی تھیں ——— !
جیسے آسمان پر چھائی ہوئی تاریک بدلیوں کے بعد دُھلی ہوئی فضاء میں آفتاب کی تیز کرنیں چمکنے لگتی ہیں اسی طرح ڈاکٹر شمی ہنستا ہوا اچانک رجبیں کے کمرے میں آیا ——— " لائیے کہاں ہیں آپ کی کتابیں ۔ جب فیل ہی ہونا ہے آپ کو تو پھر مجھے کیا " ——— ؟ رجبیں کی کھوئی کھوئی سی نگاہیں اس کی شریر آنکھوں کو دیکھ رہی تھیں " کیا یہ وہی شمی تھا ——— ؟ ایک ہی میز کے درمیان وہ آمنے سامنے بیٹھے رہتے کتابیں بکھری رہتیں اور گیارہ گیارہ بجے رات تک شمی اُسے پڑھاتا رہتا اور کبھی ایسے ہی ستایا کرتا تھا ——— پڑھتے پڑھتے رجبیں کی نظر شمی کی جیب پر پڑی اس نے ایک نیا فونٹین پن خریدا تھا ——— اس کا نب دیکھنے کو رجبیں اپنی کاپی پر لکھنے لگی ——— ے

ہم کو ان سے وفا کی ہے اُمید
جو نہیں جانتے وفا کیا ہے

شمی جھک کر دیکھنے لگا تھا ۔ " لڑکیاں ایسے اشعار نہیں لکھا کرتیں " ——— " اور لڑکے کسی کے لکھے ہوئے اشعار نہیں دیکھا کرتے " ——— ! شمی کے شوخ لبوں پر مسکراہٹ لہرا رہی تھی اور رجبیں کی کھوئی ہوئی نگاہوں میں ایک سکون جھلک رہا تھا جیسے آج وہ اپنا سارا اضطراب بھول چکی ہو ——— !
ڈاکٹر شمی عملی اناٹومی میں ہتھیلیوں کا نقشہ پڑھاتے پڑھاتے رجبیں کے

ہاتھوں کو دیکھتا ہوا بولا " دیکھوں تو کیسی ہے قسمت آپ کی " ——؟ برجیس نے خاموشی سے اپنا ہاتھ میز پر پھیلا دیا —— "آپ کی عمر اتنی لمبی اتنی لمبی ہے کہ بس مرنے سے اطمینان ہی رکھئیے، اور آپ —— شاعرہ اور ادیبہ ہوتیں مگر توجہ نہیں کی۔ آپ کی آنکھیں بھی تو یہی کہہ رہی ہیں ——! ارے تو یہ آپ کا میاں بڑے ٹھس قسم کا ہوگا اور بے شمار بچے " —— برجیس کی تکتی ہوئی آنکھیں خود بخود نیچے جھک گئیں —— " ہاں آپ کے ہاتھ میں کامیابی کی لکیر بہت اونچی گئی ہے، یہ دیکھئے ——! مگر —— مگر اوہنہ —— آپ کا دل —— بالکل خراب ہے بے پروا سخت اور احساس سے یکسر خالی —— آپ کسی سے محبت کر ہی نہیں سکتیں " —— " بس بس سمجھ گئی اتنی دیر سے جھوٹ موٹ اُلٹی سیدھی باتیں جمائے جا رہے ہیں " —— برجیس نے شمی کے ہاتھوں سے اپنی کلائی چھڑاتے ہوئے کہا ——! " جی ڈاکٹر صاحبہ میں نہیں کہتا چیرہ کی باتیں ہیں یہ سب " —— " تو کون بڑا آپ کا چیرہ ہی سچا ہے۔ ایک دم سے جھوٹی ہیں یہ ساری باتیں ہاں اچھا ہے جب آپ کی پریکٹس نہ چلے تو یہی سب کیجئے گا۔ آمدنی کی ایک صورت ہے یہ بھی " —— اس کے بعد شمی میز پر برجیس کے پھیلے ہوئے ہاتھ پر اپنے قلم سے ٹھو کے دیتا اس کی گھڑی کے فیتے اور اس کی چوڑیوں سے غیر شعوری طور پر کھیلتا رہتا تھا —— برجیس کی گھڑی کا فیتہ اس کی کلائیوں میں جھنجھناتی ہوئی رنگ برنگی چوڑیاں اور اس کی انگلی میں سفید نگ کی سُنہری انگوٹھی یہ سب شمی کے کھلونے تھے اور جب برجیس شمی کو ان کھلونوں سے کھیلتے دیکھتی تو پھر

اُسے اپنا ہوش بھی نہ رہتا تھا ـــــ مگر پھر بھی شمی اس کے لئے ایک معمہ ہی تھا۔ خاموش سنجیدہ اور کبھی شوخ اور ایک شریر سا معمہ اور اس رنگ بدلتی ہوئی پہیلی کو سمجھنے کے لئے وہ کتنی کوشاں تھی ـــــ! مگر اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا ـــــ کہ وُہ کیا تھا ـــــ اس کی روح سے قریب تر ایک شوخ اور شریر سا شمی ـــــ یا اس سے کترا کر خاموشی سے نکل جانے والا صرف ایک بے پروا سا ڈاکٹر ـــــ!

امتحان دے کر وُہ چھٹیوں میں اپنے گھر چلی آئی ـــــ اور یہیں آکر اسے شیلا کے خط سے یہ خبر ملی کہ شمی وار میں چلا گیا ہے ـــــ ایک دم اس کے دل میں چوٹ سی لگی ـــــ اور اس کی کھوئی ہوئی نگاہوں کا اضطراب اور بھی بڑھ گیا، رہ رہ کر اس کے کانوں میں ایک بھولی ہوئی سی آواز جیسے بہت دور سے سُنائی دی۔

"کھوئے کھوئے نینوں والی کس کی یاد ستائے ـــــ؟" اب وُہ کس کو بتا سکتی تھی کہ اس کی آنکھیں کسے دیکھنے کی آرزومند ہیں ـــــ؟

اب [illegible] کے اتنے لمبے عرصے میں بھی وہ شمی کو نہ بھلا سکی تھی۔ کبھی کبھی کسی سے اس کو شمی کی خبر مل جاتی تھی۔ کہ وُہ ان دنوں کہاں ہے اسپتال کے ایک ایک حصّے سے شمی کی یاد لپٹی ہوئی تھی۔ شمی کے کمرے کے دریچوں میں ابھی تک وہی سفید پردے لٹک رہے تھے۔ وارڈ بھی وہی تھا۔ لفٹ بھی وہی اور آنے جانے کے اُسی راستے پر لوگ آجا بھی رہے تھے ـــــ مگر اب وُہ شوخ لب اور اُن ہنستی ہوئی شریر آنکھوں کو بر جبیں نہ دیکھ سکتی تھی ـــــ وُہ اپنے

کمرے کے دریچہ پر جُھکی سامنے آسمان پر پھیلی ہوئی گہری شفق کو دیکھ رہی تھی۔ —— اچانک اسے نیلو کی پیشانی پر لگی ہوئی بندی یاد آئی —— ایسی ہی سُرخ دہکتی ہوئی بندی —— وہ ایک دم سے جیسے کانپ گئی۔ اُسی چھوٹی سی سوزاں چنگاری نے تو اس کی زندگی کو خاکستر بنا دیا تھا —— اور اب وہی بندی خود اس کی پیشانی پر بھی دمکنے والی تھی —— یک بیک وہ گھبرا گئی جیسے کسی شعلے کی لو اس کی پیشانی کو چھُو گئی ہو —— اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھیگ گئیں —— "بچارو شمی۔ شفق جیسی سرخیوں کے رنگین کھیل کہاں کھیل رہا ہوگا —— ؟ کیا اب بھی اس کی آنکھوں میں وہی گہری اداسی چھائی ہوگی ؟ —— یا وہی شوخ تبسم اس وقت بھی اس کے لبوں پر لہرا رہا ہوگا —— ؟" —— اور شام کے بڑھتے ہوئے اندھیرے میں شفق کے دھبّے آہستہ آہستہ ڈوبتے جا رہے تھے —— !